www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

ستمبر 2019

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

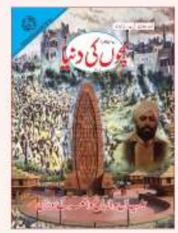

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
شخصیت	شفیقہ فرحت: پہلی مزاح نگار خاتون	ظفر الاسلام	5
نکہتِ سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		10
جہانِ نسواں	دبستان مرشدآباد کی شاعری میں عورتوں کا اہم کردار	جنیفر رضوی	11
	اختر اورینوی کا افسانوی تنوع	سید واصف غنی	18
	اردو شاعری اور تصورِ زن	قمر النساء	21
	محمد علوی اور ان کی نظمیں	انجم آرا	26
	خواجہ احمد عباس: اپنے افسانوں کے آئینے میں	شگفتہ پروین	29
قانون میں خواتین	خواتین ریزرویشن بل کی قانونی حیثیت	خواجہ عبدالمنتقم	32
کہانیاں	دوسرا سائبان	شہانہ خاتون	35
	نورزارا	شاہدہ شاہین	39
	تم ہی سے ہیں سانسیں	رومانہ عفت راہی	43
	تمھارے نام	استوتی اگروال	47
حسنِ سخن	تبسم فاطمہ، عصمت آرا		49
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		52
صحت	نظامِ ہضم اور تحلیل غذا	شکیل احمد	54
آرائش و زیبائش	حسن کی نگہداشت		58
تاثرات	نگر نگر سے		60
خواتین خبرنامہ			61

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 3 شمارہ: 9 ستمبر 2019

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، چھتہ گلی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

زبان کی ترقی کے لیے ہر ادارہ اپنے اپنے طور پر کوشش کرتا ہے۔ ہر ادارے کی اپنی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک میں بیشتر ایسے ادارے موجود ہیں جن کا بنیادی مقصد ادب اور زبان کو فروغ دینا ہے۔ یہ تمام ادارے اپنی اپنی سطح پر اردو زبان کے فروغ کے سلسلے میں آئے دن نئے لائحہ عمل تیار کرتے رہتے ہیں تاکہ زبان اور ادب دونوں کی ترقی کو ممکن بنایا جاسکے۔ اردو زبان و ادب کو فروغ دینے والے اداروں میں قومی کونسل ایک اہم ادارہ ہے جو شروع سے ہی مختلف موضوعات پر نادر و نایاب کتابوں کی اشاعت میں سرگرم عمل ہے۔ بہت قلیل عرصے میں اس ادارے نے اہم موضوعات پر عمدہ اور نایاب کتابیں شائع کی ہیں۔ علاوہ ازیں اس ادارے نے فاصلاتی نظام تعلیم اور کمپیوٹر کورس کے ذریعے بھی ان طلبا تک پہنچنے کی کوشش کی ہے جو کسی نہ کسی وجہ سے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں آج بھی ایسے بہت سے علاقے ہیں جہاں تک پہنچنا آسان کام نہیں ہے لیکن کمپیوٹر کورس کے ذریعے قومی کونسل نے اس مشکل کام کو بھی آسان کردیا ہے۔ یہ ہمارے لیے خوش آئند بات ہے کہ بہت کم عرصے میں ہزاروں طلبا اس کورس سے مستفید ہوچکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

قومی اردو کونسل وقتاً فوقتاً اردو زبان کے حوالے سے نئی نئی تدابیر پر غور کرتی ہے۔ مثلاً کونسل موبائل وین کے ذریعے اردو کو گھر گھر تک پہنچانے کا اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اردو کتاب میلوں اور اپنی نادر کتابوں کی اشاعت کے ذریعے بھی قاری تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے۔ کونسل نے ایک ایسا ایپ تیار کیا ہے جس کے ذریعے اردو کے قارئین اپنے موبائل میں درجنوں کتابیں ڈاؤن لوڈ کرکے بہ آسانی پڑھ سکتے ہیں۔ اردو زبان کے تعلق سے قومی کونسل آئے دن مختلف ادبی پروگرام بھی کراتی رہتی ہے۔ ان تمام پروگراموں کے ذریعے قومی کونسل کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ ہے اردو کو گھر گھر تک پہنچانا۔ لوگوں کے دلوں میں اردو زبان کے تئیں بیداری پیدا کرنا اور زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگوں تک اس زبان کی رسائی کو آسان کرنا تاکہ غیر اردو داں طبقہ بھی اردو کی شیرنی سے لطف اندوز ہوسکے اور اردو زبان زیادہ سے زیادہ ترقی کرسکے۔

ادب، ثقافت، قانون، طب، فلسفہ، تاریخ تعلیم، فنون لطیفہ اور ادب اطفال جیسے موضوعات پر کونسل اب تک سینکڑوں کتابیں شائع کرچکی ہے۔ کونسل سے کئی ادبی و تحقیقی رسالے بھی پابندی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں، جن میں سے ایک ماہانہ رسالہ 'خواتین دنیا' ہے۔ خواتین کے مسائل کا خیال رکھتے ہوئے کونسل سے نکلنے والے اس رسالے میں خواتین سے متعلق اہم مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ مضامین بلاشبہ خواتین کے احساسات و مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس رسالے میں ہم نے کونسل سے شائع کتاب کی ایک سیریز بھی جاری کی ہے جن سے خواتین کو اپنے آئینی حقوق کے بارے میں معلومات فراہم ہوتی ہے۔ ویسے تو کونسل ادبی، سیاسی، ثقافتی اور معاشی موضوعات پر مبنی کتابیں شائع کرتی رہتی ہے لیکن اس ضمن میں ان کتابوں کی اشاعت کا ذکر ضروری ہے جو خواتین کی صحت اور ان کے امراض سے متعلق ہیں۔ کونسل کی ویب سائٹ پر ایسی کئی کتابیں موجود ہیں جن میں خواتین سے متعلق اہم بیماریوں کی نشان دہی کی گئی ہے اور ان کے علاج کا طریقۂ کار بھی بتایا گیا ہے۔ خواتین سے متعلق علم طب کے تحت ایسی بہت سی بیماریوں کو واضح کیا گیا ہے جو آج کل ہماری خواتین میں عام ہوتی جارہی ہیں۔ بعض وقت تو عام بیماری بھی اتنا سنگین روپ اختیار کرلیتی ہے کہ اس کا علاج ناممکن سا ہوجاتا ہے۔ خواتین کو کونسل کی ان کتابوں سے مستفید ہونے کی ضرورت ہے۔ انھیں یہ جاننے کی اشد ضرورت ہے کہ وہ اپنے آپ کو تندرست اور صحت مند کیسے رکھیں۔ اس کے علاوہ ان کو یہ بھی جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ خواتین میں کون سی ایسی بیماریاں ہوتی ہیں جن کا وقت رہتے علاج ممکن ہے تاکہ بعد میں ان کو کسی بھی قسم کی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ خواتین کو اپنی صحت کے تئیں بیدار رہنے کی ضرورت ہے۔

'خواتین دنیا' اپنی منزل کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے۔ اگرچہ اس نے بہت قلیل عرصے میں اپنی شناخت قائم کرلی ہے لیکن ابھی اسے مزید سفر طے کرنا باقی ہے۔ گزشتہ رسالوں کی روشنی میں ہمیں آپ کے خیالات جاننے کا موقع ملا ہے۔ آگے بھی اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیں آگاہ کرتے رہیے تاکہ ان کی روشنی میں رسالے کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ظفر الاسلام

شفیقہ فرحت
پہلی مزاح نگار خاتون

شفیقہ فرحت کی پیدائش 26/اگست 1931 کو ناگپور میں ہوئی۔ والد کا نام محمد رستم خان تھا جو انگریز سرکار میں پولس محکمہ میں سی۔ آئی۔ ڈی تھے۔ بعد میں برہان پور کے کوتوال ہو گئے۔ شفیقہ فرحت کی تعلیم ابتدا سے پانچویں کلاس تک ناگپور کے کانونٹ اسکول سینٹ جوزف میں ہوئی، جس کا شمار اس وقت کے سب سے معیاری اسکول میں ہوتا تھا۔ ان کا اپنا بیان ہے کہ ''پانچویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے فرافر انگلش بولنے لگی تھیں۔'' 1947 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ پھر ناگپور کے c.c.w کالج سے 1951 میں بی۔اے کیا۔ ان کا ارادہ پولیٹکل سائنس میں ایم۔اے کرنے کا تھا لیکن والد کی مالی حالت بہتر نہ ہونے کی وجہ سے 1954 میں ناگپور سے ڈپلومہ ان جرنلزم کیا۔

شفیقہ فرحت نے بی۔اے کے زمانے سے لکھنا شروع کیا۔ ان کی پہلی تخلیق 1951 میں کالج میگزین میں ڈرامہ نما انشائیہ کی صورت میں شائع ہوئی۔ جرنلزم میں ڈپلومہ مکمل کرنے کے بعد ناگپور سے نکلنے والے رسالے 'چاند' کی معاون مدیر رہیں۔ 1955 میں والد کی مدد سے اپنا رسالہ ''کرنیں'' جاری کیا۔ اس کو عام طور سے بچوں کا رسالہ سمجھا جاتا ہے لیکن ان کی بہن پروفیسر شمیم علیم کے بقول:

> ''بعض لوگوں کو غلط فہمی ہے کہ یہ صرف بچوں کا رسالہ تھا، اس زمانہ کے تمام مشہور ادیب مثلاً رضیہ سجاد ظہیر، راجہ مہدی علی خان، پرکاش پنڈت، سلام مچھلی شہری (ابن انشاء، نریش کمار شاد) وغیرہ کی تخلیقات اس رسالہ میں شائع ہوئی تھیں، اور ان سب ادیبوں کو ان کی تخلیقات کا معاوضہ دیا جاتا تھا۔

(شمیم علیم، ماہنامہ شگوفہ، اکتوبر 2008، ص:21)

'کرنیں' کو بہت پسند کیا گیا یہ ہر اعتبار سے اونچے معیار کا رسالہ تھا لیکن مالی اعتبار سے کمزور پڑ گیا لہٰذا مجبوراً اسے بند کرنا پڑا۔ اس کے بند ہونے کے بعد شفیقہ فرحت نے ناگپور یونیورسٹی سے 1957 میں اردو میں ایم۔اے کیا جسے مکمل کرتے ہی مدھیہ پردیش بھوپال میں پبلک سروس کمیشن کے تحت ان کا تقرر ہو گیا اور مہارانی لکشمی بائی گرلز کالج میں اردو کی لکچرر مقرر ہو گئیں۔ 1957 میں شفیقہ فرحت بھوپال گئیں اور زندگی کے قیمتی پچاس برس انھوں نے وہیں گزارے۔ دوران ملازمت انھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے 1962 میں فارسی میں ایم۔اے کیا، اس کے بعد حمیدیہ کالج بھوپال میں اردو کی لکچرار اور صدر شعبہ اردو ہوئیں۔ کسی زمانے میں اسی کالج میں جاں نثار اختر کی اہلیہ اور مجاز کی بہن صفیہ اختر استاد رہ چکی تھیں۔ شفیقہ فرحت نے بھی بہت جلد حمیدیہ کالج میں اپنی ایک خاص شناخت اور مقبولیت حاصل کر لی۔ بھوپال میں قیام اور دورانِ ملازمت انھوں نے ''نظیر اکبرآبادی ایک مطالعہ'' (ہندی میں) کے عنوان سے تحقیقی مقالہ تحریر کیا جس پر جیواجی یونیورسٹی گوالیار نے انھیں ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ 1991 میں ملازمت سے سبک دوش ہوئیں۔

ناگپور کو خیر باد کہنے کے بعد بھوپال میں ان کی خوب ترقی ہوئی۔

انجمن ترقی اردو مدھیہ پردیش کی جنرل سکریٹری، انجمن ترقی پسند مصنفین مدھیہ پردیش کی نائب صدر اور مدھیہ پردیش کی مجلس عام و مجلس عاملہ کی رکن رہیں۔ بھوپال میں خواتین کی ادبی اور سماجی انجمن 'دھنک' کی صدر رہیں۔ ورڈ رائٹرس اسوی ایشن سے بھی وابستہ تھیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ویمنس کونسل کی نائب صدر اور تاعمر ممبر رہیں۔

بھوپال کی متوسط طبقے کی مسلمان خواتین کو آگے بڑھانے، ترقی پسندی کو عام کرنے اور روشن خیالی کو تحریک دینے میں ان کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی دوسری خاتون کو نہ مل سکا۔ اگرچہ نواب سلطان جہاں بیگم نے بیداری اور تعلیم کو عام کرنے کے لیے زبردست کوششیں کیں مگر ایک حکمراں عوامی اور زمینی سطح پر اس طرح مواصلت نہیں کر سکتی تھیں، جس طرح شفیقہ فرحت وابستہ ہوئیں۔ وہ ہر اس تحریک خیال اور عمل کا حصہ بنیں، جو جہالت تاریکی اور نابرابری کے اندھیروں کو دور کر سکے اور ہندوستان کی سالمیت کو مضبوطی فراہم کر سکے۔

شفیقہ فرحت ہمہ وقت دوسروں کی مدد کے لیے تیار رہا کرتی تھیں، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی مالی حالت بہتر نہ تھی مگر ایسا نہیں تھا، دراصل وہ خود کے کھانے پینے، رہنے سہنے پر پیسہ نہ خرچ کر کے دوسروں کی مدد کر دیا کرتی تھیں۔ مثلاً کسی کو آٹے کی چکی فراہم کر دی، کسی لڑکی کی شادی میں جہیز دلوا دیا کسی صاحب کا گھر جل گیا تو اسے سنوارنے میں لگ گئیں۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد بھی وہ مسلسل فلاحی اور سماجی کاموں میں مشغول رہیں۔ کوثر صدیقی لکھتے ہیں:

> ''ادب کے میدان کے باہر بھی انھوں نے قابل ذکر خدمات انجام دیں۔ سماجی خدمات کے میدان میں آپ ہمیشہ نابیناؤں کی مدد اور ان کے فلاحی کاموں میں پیش پیش رہیں۔ آپ مدھیہ پردیش کی نابیناؤں کی انجمن M.P. Blind Association کی صدر بھی رہیں اور آپ نے بھوپال میں ایک بریل لائبریری (نابیناؤں کے طریقہ نوشت وخواند کے رسم الخط کی لائبریری) بھی قائم کی، جس میں نابیناؤں کو پڑھنے لکھنے کی تربیت دی جاتی ہے۔''

(ہماری زبان یکم تا 7 مارچ 2008، ص:8)

شفیقہ فرحت نے عام خواتین قلم کاروں کی روش سے ہٹ کر طنز و مزاح اور ظرافت نگاری کو اپنی تحریر کا موضوع بنایا۔ اس فن میں وہ اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ لوگوں کو اپنی فکر تبدیل کرنی پڑی۔ اس سلسلے میں ہاجرہ مسرور رقم طراز ہیں کہ:

> ''میں نے فون پر آپ سے کہا تھا کہ طنز و مزاح نگاری خواتین کو زیب نہیں دیتی مگر اب آپ کی کتاب پڑھ کر اپنے الفاظ واپس لیتی ہوں، اور یہ محسوس کرتی ہوں کہ اب بھی آپ کو وہ مقام نہیں ملا جس کی آپ بجا طور پر مستحق ہیں۔''

(بحوالہ ٹیڑھا قلم، ص:4)

اس میں کوئی شک نہیں کہ شفیقہ فرحت ہندوستان کی پہلی مزاح نگار خاتون تھیں۔ ان کی تحریروں میں طنز و مزاح کا بہترین امتزاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنے پہلے مجموعے ''لو آج ہم بھی'' کے ذریعے ہی انھوں نے اس میدان میں قدم بڑھایا۔ یہ مجموعہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی کے زیر اہتمام 1981 میں شائع ہوا۔ اس میں کل 15 مضامین شامل ہیں۔ میری روم میٹ، تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں، ذرا دھوم سے نکلے اور حضرت آلو اس کے بہترین نمونے ہیں۔ 'حضرت آلو' میں آلو کی مختلف خوبیوں سے قاری کو مزاحیہ انداز میں روبرو کرایا گیا ہے۔ گویا وہ کہتی ہیں کہ آلو خدا کی ایسی نعمت ہے جس تک امیر و غریب، گدا و فقیر سب کی رسائی ہے۔ امید کے تمام دروازے بند ہونے کے بعد لوگوں کو بے چارہ آلو ہی یاد آتا ہے۔ اس کے علاوہ شفیقہ فرحت نے آلو کی مختلف خصوصیات کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس مضمون کو انھوں نے لندن کی کسی تقریب میں پڑھا تھا، جسے مشتاق احمد یوسفی نے بہت پسند کیا تھا۔ 'حضرت آلو' سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''جب بے موسم کی بارش اور موسم کے اولوں کی طرح مہمان آپ کو ایصال ثواب کا موقع عطا کرتے ہوئے عذاب بن کر نازل ہو جائیں اور فرار کے سارے راستے مسدود اور بازار کی ساری دکانیں بند ہو جائیں۔۔۔ اس وقت یہی آلو اپنی بے رنگی سے آپ کے دسترخوان میں رنگ اور مہمانوں کے دل میں ترنگ بھر دے گا۔''
>
> ''ویسے آلویات کے صحیح اور اصل مراکز ہوٹل اور ہوسٹل ہوا کرتے ہیں۔۔۔ ماہر آلویات اپنی آلو شناسی کے ایسے ایسے نمونے پیش کریں گے کہ ہر کھانے والا بہ رقت و دقت یہ شعر پڑھتا ہوا ڈائننگ ہال سے نکلے گا:''
>
> ہال میں پھر آلو نے ایک شور اٹھایا ظالم
> آہ جو برتن اٹھایا اس میں آلو نکلا
>
> ''ان مقامات آہ و فغاں میں بشرط استواری ہر دن وہر رات کا مینو آلو ہی ہوتا ہے۔ یعنی آلو پراٹھا۔ آلو پلاؤ۔ آلو چلاؤ۔ آلو گوبھی۔ آلو مٹر۔ آلو ٹماٹر۔ آلو بیگن۔ آلو سیم۔ آلو گوشت۔ آلو

مچھلی۔ آلو مرغ۔ یا پھر آلو آلو۔ مثلاً آلو دم۔ آلو رائیتہ۔ آلو حلوہ۔ آلو کھیر۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔ وغیرہ۔"

(حضرت آلو، مشمولہ 'لو آج ہم بھی')

طنز و مزاح اور انشائیہ کے فن سے شفیقہ فرحت خوب واقف ہیں۔ زبان کی سلاست و روانی کے علاوہ الفاظ کی الٹ پھیر اور اشعار میں حرف کی تبدیلی سے ایسا مزاح پیدا کرتی ہیں کہ قاری ہنسنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل پر بھی ان کی اچھی گرفت ہے۔ انھوں نے جن مسائل کو اپنے طنز کا موضوع بنایا ہے وہ ہماری زندگی سے کافی قریب نظر آتے ہیں۔ "میری روم میٹ" اس کی عمدہ مثال ہے۔ یہ بیانیہ طرز کا مزاحیہ مضمون ہے جس میں روم میٹ کی زبانی کہانی بیان کی گئی ہے۔ روم میٹ اپنی ساتھی سے اس قدر پریشان ہے کہ شب معراج جب لوگ جہنم سے رہائی کے لیے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں، وہ اپنی روم میٹ سے نجات کی دعا کر رہی ہے۔ روم میٹ ایک ایسی افسانہ نگار ہے جس کا آج تک کوئی افسانہ شائع نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ رسالے سے واپس کر دیا جاتا ہے۔ افسانہ نگار صاحبہ ہیں کہ ان کو ہمہ وقت نئے نئے افسانوں کے پلاٹ وحی کی صورت میں نازل ہوتے رہتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

"ابھی صبح کے صرف آٹھ بجے ہیں۔ میں بستر میں دبکی اپنے ادھورے خواب پورے کرنے کی آس میں آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کر رہی ہوں کہ آواز آتی ہے۔

"ارے بھئی سننا ذرا۔۔۔۔ وہ غضب کا پلاٹ سوجھا ہے۔" پھر وہ اپنا بیچارہ خواب تو گیا جہنم میں، ان کا غضب کا پلاٹ غضب ڈھانے لگتا ہے۔"

"رات کے دس بجے ہم نے بڑی کوشش سے اپنے دل و دماغ کو پالٹکس پڑھنے پر مجبور کیا۔ ابھی ایک ہی پیراگراف پڑھا تھا کہ آپ کے دماغ میں پھر پلاٹ کی وحی نازل ہونے لگتی ہے پھر کہاں کی پالٹکس اور کہاں کی اکنومکس۔!"

(میری روم میٹ، مشمولہ 'لو آج ہم بھی')

"ذرا دھوم سے نکلے" ایک ایسا مزاحیہ مضمون ہے جس میں مرزا غالب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ آج جب کہ ملک کے ہر شہر میں غالب اکیڈمیاں بنی ہوئی ہیں اور غالب کا جشن منایا جا رہا ہے۔ شفیقہ فرحت نے غالب کو یاد کرنے کے کچھ نئے زاویے تلاش کیے ہیں۔ وہ کہتی ہیں غالب کے پسندیدہ فعل کو اپنایا جائے تا کہ ان سے محبت کا صحیح معنی میں حق ادا کیا جا سکے۔ اقتباس دیکھیں:

"فلم مرزا غالب شہر شہر، گلی گلی گھر گھر مفت دکھائی جائے اور ایک سے زیادہ بار دیکھنے والوں کے لیے خاطر خواہ انعام بھی مقرر کیا جائے۔"

"آم غالب کو بے حد پسند تھے۔ اس لیے آموں کا ایک باغ "غالب باغ" کے نام سے لگوایا جائے اور قلمی آموں کی کسی خاص قسم کا نام بھی 'غالب' آم رکھا جائے اور آموں کے موسم میں عقیدت مند باغ میں جائیں جشن آم منائیں۔"

(ذرا دھوم سے نکلے، مشمولہ 'لو آج ہم بھی')

شفیقہ فرحت کا دوسرا طنزیہ و مزاحیہ مجموعہ "رانگ نمبر" 1986 میں نئی آواز، مکتبہ جامعہ نئی دہلی کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ اس پر ماہنامہ "نقش کوکن"، بمبئی ماہ جون / 1987 میں یوسف ناظم نے تبصرہ کیا تھا۔ شفیقہ فرحت کے انشائیوں کا تیسرا مجموعہ "گول مال" کو بھی مکتبہ جامعہ نئی دہلی نے 'نئی آواز' اشاعتی پروگرام کے تحت 1988 میں شائع کیا۔ اس کی اشاعت کے تقریباً دس سال بعد انور سدید کا مختصر تبصرہ "شگوفہ" حیدرآباد

میں شائع ہوا۔ ان کی دیگر مطبوعہ تصانیف کے نام درج ذیل ہیں۔ ''رانگ نمبر'' طنزیہ و مزاحیہ مضامین 1986، ''گول مال'' طنزیہ و مزاحیہ کہانیاں 1988، ''چوں چوں بیگم'' طنزیہ و مزاحیہ کہانیاں بچوں کے لیے، 1988، ''ٹیڑھا قلم'' طنزیہ و مزاحیہ مضامین، 2003، ''نیم چڑھے'' طنزیہ و مزاحیہ مضامین 2004، ''چہرے جانے انجانے''، ''شخصیات کے خاکے'' 2006۔

کوثر صدیقی کی اطلاع کے مطابق ان کی غیر مطبوعہ تخلیقات کے نام یہ ہیں۔ ''بچوں کے نظیر اکبرآبادی''، ''چہرے جانے انجانے'' (حصہ دوم، دھنک کے ہزار رنگ) ''چہرے جانے انجانے'' (حصہ سوم، ان سے ملیے میرے ساتھ)، ''نئی دیوار چین'' (سفرنامہ)، ''سات سمندر پار'' (سفرنامہ)، ''بے اجالا شہر'' (بھوپال گیس المیہ پر ناول) ''پتھر گلی کی کالی کجلی سیپ'' (نثری نظموں کا مجموعہ)۔

(کوثر صدیقی، ہماری زبان یکم تا 7 مارچ 2008، ص: 7)

شفیقہ فرحت کی تخلیقی صلاحیتوں کا اندازہ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

''اردو کی واحد خاتون ہیں جنھوں نے طنز و مزاح کو بطور صنف سخن اپنایا اور اس کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا برسوں سے لکھ رہی ہیں۔ انھیں سب جانتے پہچانتے ہیں۔ ان کے بارے میں میری رائے کیا اہمیت رکھتی ہے۔'' (بحوالہ ٹیڑھا قلم، ص: 4)

یہ حقیقت ہے کہ شفیقہ فرحت نے اردو ادب اور طنز و مزاح کی جو آبیاری کی اس کی پذیرائی ملکی پیمانے پر نہیں ہوئی جن کی وہ مستحق تھیں۔ مشاہیر بھوپال پر شائع شدہ تصانیف کے علاوہ باقی اہم ناقدین نے ان کے فن پر گفتگو نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر قمر رئیس نے اپنی کتاب ''اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور ہمعصر رجحانات'' میں بھی شفیقہ فرحت کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ اس تصنیف میں نہ شفیقہ فرحت کا ذکر ہے اور نہ ہی ان کے فن یا تصانیف پر کوئی گفتگو کی گئی ہے۔ یہ کتاب 1986 میں شائع ہوئی جبکہ شفیقہ فرحت کی پہلی تصنیف ''لو آج ہم بھی'' 1981 میں منظر عام پر آچکی تھی، اور شفیقہ فرحت 1951 سے مسلسل اردو کے پرچوں اور ادبی رسالوں میں لکھ رہی تھیں۔ نامی انصاری کی تصنیف ''آزادی کے بعد اردو نثر میں طنز و مزاح'' (1997) میں بھی ان پر کوئی خامہ فرسائی نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ اس زمانے تک شفیقہ فرحت کی چار تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر ثروت خان نے ''اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت'' کے موضوع پر منعقد سمینار میں ''اردو کے تانیثی ادب میں طنز و مزاح کے عناصر'' کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اس میں وہ لکھتی ہیں:

''اردو زبان و ادب کے میدان میں جہاں ایک طرف فرحت اللہ بیگ، پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی، سجاد حیدر یلدرم سے لے کر مشتاق احمد یوسفی اور مجتبیٰ حسین تک متعدد طنز و مزاحیہ نگار ہوئے، تانیثی ادب میں ایسے شاہکار ڈھونڈے نہیں ملتے۔''

(ثروت خان، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت، ص 358، 351)

جب کہ آگے اسی مضمون میں انھوں نے شفیقہ فرحت کے تینوں مجموعے ''لو آج ہم بھی، رانگ نمبر اور گول مال کے منظر عام پر آنے کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر ثروت خان اگر شفیقہ فرحت کی تصانیف اور ان کے مضامین کا گہرائی سے مطالعہ کرتیں تو ان کی تحریری صلاحیتوں کا اعتراف ضرور کرتیں، اور وہ خواتین کے لیے ''ڈھونڈھے نہیں ملتے'' کا لفظ شاید استعمال نہ کرتیں۔

مردوں کی بنائی اس دنیا میں جہاں شادی کے بغیر عورت کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے شفیقہ فرحت نے پوری زندگی تنہا بسر کی، اور یہ باور

کرایا کہ عورت تنہا زندگی گزار سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ان کے لیے رشتوں کی کمی تھی۔ پنجاب کے ایک مشہور شاعر اس امید میں بھوپال مع بوریے بستر کے آگئے کہ شاید نظر کرم ہو جائے، لیکن شفیقہ فرحت شادی کے بندھن میں قید ہو کر کسی کے تابع زندگی گزارنے کے لیے خود کو تیار نہ کر سکیں۔ اقبال مسعود ان کی شادی سے متعلق واقعے کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''پاکستان کے شہرہ آفاق محقق مشفق خواجہ جب بھوپال تشریف لائے تو انھوں نے شفیقہ فرحت سے ایک انٹرویو لیا تھا۔۔۔ جب مشفق خواجہ نے شادی کے بارے میں سوال کیا اور کہا کہ اب کیا ارادہ ہے اور اس وقت وہ پچپاسویں موسم بہار سے گزر رہی تھیں تو انھوں نے تپاک سے کہا کہ۔

میں محبت کی نگاہوں کو سمجھ سکتی ہوں
میرے معیار کے قابل کوئی پیغام تو دے

اور اگر آج کوئی مل جائے تو سبحان اللہ۔ ان کا جواب جو ہنسی کے پس پردہ ایک آنسو کی طرح چمک رہا تھا زندگی بھر ان کی آنکھوں کو نمناک کرتا رہا۔''

(اقبال مسعود، نئی کتاب جنوری تا مارچ 2011، ص:177)

شفیقہ فرحت کو سیر و تفریح اور ملک و بیرون ملک کی سیاحت کرنا بہت پسند تھا۔ ہندوستان کے تمام مضافات کے علاوہ کئی بین الاقوامی کانفرنس میں انھوں نے شرکت کی۔ یوروپ، امریکہ، چین، جاپان اور پاکستان کے علاوہ انھوں نے متعدد ملکوں کا سفر کیا۔ ان میں سے کچھ ملکوں کے سفرنامے انھوں نے تحریر کیے ہیں ان ہی میں سے ''سفرنامہ چین'' بھی ہے۔ بقول پروفیسر عذرا جمال:

''یہ سفرنامہ ڈائری کے انداز میں ہے۔ چین کا یہ سفر International Women Confrerance میں خواتین کی ادبی و ثقافتی انجمن ''دھنک'' کی نمائندگی کے طور پر کیا گیا تھا۔''

(عذرا جمال، ماہنامہ شگوفہ اکتوبر 2008، ص:29)

ان کی آخری تخلیق 'چہرے جانے انجانے' کی رسم رونمائی سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر عبدالکلام کے ہاتھوں ہوئی۔ رسم اجرا سے چند روز قبل وہ فریکچر سے دوچار ہوگئیں، تب بھی ہمت نہیں ہاری اور ایمبولنس میں اسٹریچر پر راج بھون پہنچ گئیں، اس طرح راج بھون میں ڈاکٹر عبدالکلام نے ان کی کتاب کے رسم رونمائی کو انجام دیا، اس تقریب کی تصویر اخباروں میں شائع ہوئیں۔

شفیقہ فرحت نے 77 برس کی زندگی پائی۔ ان کی بہن لکھتی ہیں:

''2000 تک آپا بالکل صحت مند تھیں لیکن اس کے بعد سے ان کی صحت خراب رہنے لگی اور وہ بھی ان کی اپنی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے، نہ کبھی ڈاکٹر سے رجوع ہوئیں اور نہ کبھی کوئی دوا لیتیں۔''

(شمیم علیم، ماہنامہ شگوفہ اکتوبر 2008، ص:23)

6/نومبر 2007 کو وہ گھر میں گر گئیں اور ان کی کولہے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ اس کے بعد وہ کبھی صحت یاب نہ ہو سکیں، بالآخر 6/جنوری 2008 کو بھوپال میں ان کا انتقال ہو گیا۔ شفیقہ فرحت کی ادبی خدمات کے صلے میں اب تک جو تحریریں منظر عام پر آئی ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

''بچوں کی شفیقہ فرحت'' پروفیسر انیس سلطانہ؛ مکتبہ پیام تعلیم جامعہ نگر دہلی، 1996۔

''شفیقہ فرحت'' مشمولہ: اردو نثر کے طنزیہ و مزاحیہ ادب میں بھوپال کا حصہ، رشیدہ بیگم، 2002۔

''شفیقہ فرحت فن اور شخصیت'' نجیب رامش، مشمولہ؛ ''نیم چڑھے'' 2004۔

ماہنامہ 'شاعر' ممبئی، گوشہ شفیقہ فرحت؛ اکتوبر 2005۔

''ہندوستان کی پہلی ظرافت نگار خاتون: شفیقہ فرحت'' ہماری زبان، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، یکم تا 7 مارچ 2008۔

ماہنامہ 'شگوفہ' حیدرآباد، بیاد شفیقہ فرحت؛ اکتوبر 2008۔

''وہ ایک خوشبو جو کھو گئی ہے'' (خاکہ) اقبال مسعود، سہ ماہی رسالہ 'نئی کتاب' جنوری تا مارچ 2011۔

''آہ ڈاکٹر شفیقہ فرحت صاحبہ'' مشمولہ؛ کیا لوگ تھے، رام پرکاش کپور، 2012۔

''ڈاکٹر شفیقہ فرحت'' مشمولہ؛ تذکرہ شخصیات بھوپال، شگفتہ فرحت، 2014۔

شفیقہ فرحت فن اور شخصیت، مقالہ برائے ایم۔اے، مہرالنساء عارف، دیوی اہلیا یونیورسٹی اندور۔

□□□

Zafrul Islam
Research Scholar
Jamia Millia Islamia
New Delhi-110025

شاعرات کے منتخب اشعار

اس گھڑی کوچۂ دلدار سے تو آتی ہے
تیرے دامن سے صبا پیار کی بو آتی ہے

دل وہ بلبل کہ کنارہ جسے گلزار سے تھا
اک فقط کام اسے کوچۂ دلدار سے تھا

راضیہ خاتون جمیلہ

نشان منزل سے بے خبر ہیں اور کارواں سے جدا ہوئے ہیں
نظر تو آتی ہیں لاکھ راہیں مگر کوئی راہ بر نہیں ہے

خبردار اے نثار ان سے نہ کہنا راز الفت کا
کہ ناکامی سزا ہے انکشاف حال دل کی

نثار فاطمہ کبریٰ

اے خدا اب تو ہی مالک ہے دل نادان کا
اس گرفتار بلا اس عقل کے دشمن کی خیر

حد کو پہنچی تھی محبت مری تیرے آگے
ہو گئی حد سے یہ کم بخت سوا تیرے بعد

ز۔خ۔ش

تجلیوں نے نقاب الٹا لبوں پہ آیا حسیں تبسم
نوید آئینۂ تخیل تجھے وہ بے خود بنا رہے ہیں

عزیز خاطر ہے باغباں کی قفس کے خوگر بھی ہو گئے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں سے فصل گل میں نشیمن اپنا جلا رہے ہیں

رابعہ پنہاں

جو ہیں علم و دولت میں فائق انھیں بھی
نہیں کسب و محنت سے کچھ عار دیکھو

بہم اتفاق اور تنظیم ملت
یہ ہیں کامیابی کے آثار دیکھو

امیہ بیگم شروانی

اف رے عالم تری رعنائی کا
آئینہ رخ ہے تماشائی کا

ہے نظر میں وہ چہرہ روشن
آنکھ میں آفتاب رہتا ہے

محمودہ خاتون محمودہ

کسی کے چار تنکے ہوں چمن میں
فلک کی آنکھ میں وہ آشیاں ہے

ترے صحرا و بیاباں تو ہیں آباد تمام
مرا حسرت کدۂ قلب ہی آباد نہیں

زیب عثمانیہ

چمن میں پھول ہوں، گل میں بہ رنگ بو ہوں پوشیدہ
کہیں تعبیر ہستی ہوں، کہیں خواب پریشاں ہوں

بشیر اب گردش شام و سحر کی یاد باقی ہے
کہاں تک ساتھ دے سکتے زمین و آسماں اپنا

بشیر النساء بیگم بشیر

جنیفر رضوی

دبستان مرشدآباد کی شاعری میں عورتوں کا اہم کردار

دبستان مرشدآباد میں اردو کی نشو ونما میں مردوں کے ساتھ عورتوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ اگر مردوں کے ساتھ ہماری عورتیں اس زبان کونہیں اپناتی تو یہ زیادہ سے زیادہ ہندوستان میں فارسی، بنگلہ اور انگریزی زبانوں کی طرح ایک سرکاری، کاروباری یا دفتری زبان ہی بن کر رہ جاتی اور کبھی بھی یہ ہماری گھریلو زبان نہ ہو پاتی اور اب تک ایک قومی زبان کا درجہ اسے حاصل نہ ہوتا اور نہ ہی کروڑوں لوگوں کی آج یہ مادری زبان بن پاتی۔ ویسے اردو زبان کی ترویج وتوسیع میں اور اسے ہندوستان گیر شہرت عطا کرنے میں عورتوں کا بڑا ہاتھ رہا ہے لیکن ان کے کارناموں پر بہت کم توجہ دی گئی ہے چنانچہ شانتی رنجن بھٹاچاریہ اپنی مشہور کتاب ''بنگال میں اردو زبان وادب'' میں رقم طراز ہیں:

> ''اردو ادب کے ابتدائی دور ہی سے خواتین نے اس میں حصہ لینا شروع کیا اوران کی زبان ہی کو ہم نے ریختی کا نام دیا۔ لیکن عورتوں کے کلام اور نثری کارناموں پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے۔'' (ص۔113)

بہت ہی افسوس کا مقام ہے کہ عہد قدیم کی خواتین کی تخلیقات کا بیشتر حصہ متاع گم شدہ ہے اس کے علاوہ خواتین کی تخلیقات منظر عام پر نہ آنے کی اور بھی مختلف وجوہات ہیں جیسے آج تک تحقیق وتلاش کے میدان میں مردوں کا پلّہ ہمیشہ سے خواتین کی تخلیقات پر بھاری رہا ہے اور مرد شعوری یا غیر شعوری طور پر عورتوں کی تخلیقات کو کم تر درجہ کی تخلیقات سمجھتے رہے ہیں اور شاید آج بھی بڑی حد تک یہ خیال زندہ ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے سماج میں ایک طویل مدت تک عورتوں کو صرف ''گھر کی دیویاں'' بنا کر رکھا گیا تھا اور تعلیم نسواں کو غیر ضروری سمجھا گیا تھا۔ بڑی تعجب کی بات ہے کہ بیسویں صدی کے سب سے بڑے اردو شاعر اور فلسفی علامہ اقبال بھی ایک نہایت محدود دائرے پر ہی تعلیم نسواں کو ضروری سمجھتے ہیں اور انھوں نے عورتوں کی جدید اور اعلیٰ تعلیم کی مخالفت کی ہے۔ اس کے بعد تو سب سے بڑا مسئلہ ہمارے سماج کی دیگر پابندیاں اور رکاوٹ رہی ہیں جس کی وجہ سے ہمیں خواتین کی تخلیقات کا علم نہ ہو سکا۔ اس وجہ سے دبستان مرشدآباد کی ادبی تاریخ میں خواتین کی کارکردگی اور ان کی خدمات کی کمی کا شدید طور پر احساس ہوتا ہے بہرحال دبستان مرشدآباد کی عام زبان بنگالی ہے لیکن یہاں اتر پردیش، دہلی، لکھنؤ اور بہار سے آکر بسنے والوں کی زبان اردو تھی۔

نامور مثنوی نگار شرف النساء شرف

20 ویں صدی میں دبستان مرشدآباد کے نواب خاندانوں میں بہت سی نامور ادیبہ اور خوش فکر شاعرہ گزری ہیں لیکن ان کی شاعری یا انشا پردازی کوئی افادی حیثیت نہیں رکھتی۔ ان کے یہاں کوئی مستقبل تصنیف یا کلام کا مجموعہ نہیں ملتا لیکن انیسویں صدی سے لے کر آج تک دبستان مرشدآباد نے جو اہل قلم خواتین پیدا کیے ہیں ان کا نام دنیائے ادب میں فخر سے لیا جا سکتا ہے۔ ان ہی خواتین میں سے ایک خواتین کا نام شرف النساء

شرف ہے جن کا ذکر کیے بغیر دبستان مرشد آباد مکمل نہیں ہو سکتی ہے۔

دبستان مرشد آباد کے اردو ادب میں آپ کی پہچان ایک مثنوی نگار کی حیثیت سے ہے۔ آپ نے ایک مثنوی تخلیق کی ہے جس کا نام ''ہرمز نامہ'' ہے یہ ایک ہی مثنوی آپ کو حیات جاوید بخشتے ہوئے ہے۔ جب بھی کبھی مثنوی کی تاریخ لکھی جائے گی تب آپ کی مثنوی ''ہرمز نامہ'' کا ذکر کیے بغیر مثنوی کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ ''ہرمز نامہ'' نے نہ صرف آپ کو حیات جاوید بخشا ہے بلکہ دبستان مرشد آباد کو بھی تاریخ کے اوراق میں شہرت دوام بخشا ہے۔

''ہرمز نامہ'' ایک قدیم مثنوی ہے جس کا پتہ ہمیں سب سے پہلے وفا راشد کی کتاب ''بنگال میں اردو'' کے ذریعہ ہوا ہے۔ وفا راشدی اپنی کتاب ''بنگال میں اردو'' میں لکھتے ہیں:

''ایسی خواتین میں انیسویں صدی کے اول نصف دور میں ایک خاتون کا پتہ چلتا ہے جن کا نام شرف النساء ہے۔ وہ مرشد آباد کے نواب ناظموں کے دربار سے وابستہ تھیں۔ ان کی ایک قدیم المثال قلمی مثنوی پروفیسر محفوظ الحق ایم اے مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔''

(ص251-251)

آپ کی پیدائش لکھنؤ میں ہوئی لکھنؤ سے مرشد آباد کا سفر آپ نے کیسے طے کیا اس کو لے کر محققین کے درمیان اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر سید محمد رضا علی خان اپنی کتاب ''مرشد آباد اردو ادب کا ایک قدیم مرکز'' میں لکھتے ہیں کہ:

''مرشد آباد نظامت خاندان کی روایت کے مطابق بی شرفن مرزا ماہر عظیم آبادی کی بہن تھیں۔ مرزا ماہر صاحب ہنر تھے اور شاعر بھی تھے نواب فریدوں جاہ کے عہد نظامت میں تلاش معاش میں مرشد آباد آئے اور نواب موصوف نے انھیں نواب مدرسہ کے نظامت ہوسٹل میں اتالیق کے عہدے پر مقرر کیا۔ جب ماہر صاحب کا خاندان مرشد آباد پہنچا تو بی سرفن جو ان کی بہن تھی ساتھ ہی مرشد آباد آئی تھیں۔ مرزا ماہر کا گھرانہ تعلیم یافتہ تھا چنانچہ بی شرفن کو نواب فریدوں جاہ کے محل میں ان کی بیٹی ہرمزی بیگم اور دیگر بچوں کو تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا گیا تھا بعد میں نواب فریدوں جاہ نے بی شرفن سے نکاح کر لیا اور ان کا نام شرف النساء بیگم رکھا گیا۔ خاندانی ریکارڈس کے مطابق شرف النساء کی پہلی اولاد 1857 میں پیدا ہوئی جن کا نام خاقان مرزا تھا۔'' (ص186)

ڈاکٹر محمد ہاشم نے اپنی کتاب ''مرشد آباد (مغربی بنگال) کی ایک نایاب مثنوی ہرمز نامہ'' میں لکھا ہے کہ:

''اصلاً شرف النساء نواب فریدوں جاہ کے محل کی ایک کنیز تھیں جو ان کے منجھلے بیٹے سید علی مرزا عرف منجھلے حضور کی بیگم مہتاب آرا عرف بالا دلہن کے ساتھ لکھنؤ سے مرشد آباد آئی تھیں جب وہ بیاہ کر نواب فریدوں جاہ کے محل میں آئیں تو ان کے ساتھ رواج زمانہ کے مطابق کئی خواتین بھی لکھنؤ سے مرشد آباد آئی تھیں انھیں میں ایک بی شرفن بھی تھیں جو کم عمر لیکن ہوشیار اور تعلیم یافتہ تھیں۔ کنیز ہوتے ہوئے بھی محل میں ان کا بہت احترام تھا۔ وہ فریدوں جاہ کی بچیوں کو تعلیم دیا کرتی تھیں جب وہ بالغ ہو گئیں تو نواب فریدوں جاہ نے انھیں اپنے نکاح میں لے لیا اور اس طرح وہ بی شرفن سے شرف النساء بیگم ہو گئیں'۔

ڈاکٹر رضا علی اور ڈاکٹر محمد ہاشمی دونوں کے مطابق یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ فریدوں جاہ نے بی شرفن کو نکاح کے بعد شرف النساء بیگم بنا دیا بہرکیف مجھے یہاں اس بات سے بحث نہیں کرنی ہے کہ وہ کیا تھیں اور کیا بنیں بلکہ میں اس بات کو واضح کرنا چاہتی ہوں کہ 19 ویں صدی میں دبستان مرشدآباد کی بیگمات کو بھی جو محل کی چہار دیواری کے اندر زندگی بسر کرتی تھیں اور وہ بھی ایسے ماحول میں جس کے بارے میں ڈاکٹر جاوید نہال نے یہاں تک کہا ہے کہ ناظمین مرشدآباد کے محلات میں غیر محروم عورتوں کو بہت مشکل سے داخلہ ملتا تھا۔ ان کے یہاں پردہ کا بہت اچھا انتظام ہوتا تھا اس طرح زندگی بسر کرنے کے باوجود یہاں کی عورتیں زبان و ادب سے گہری دلچسپی اور دلی لگاؤ رکھتی تھیں یہ بھی اہل قلم کی سرپرستی میں نوابوں سے کسی قدر پیچھے نہیں تھیں۔

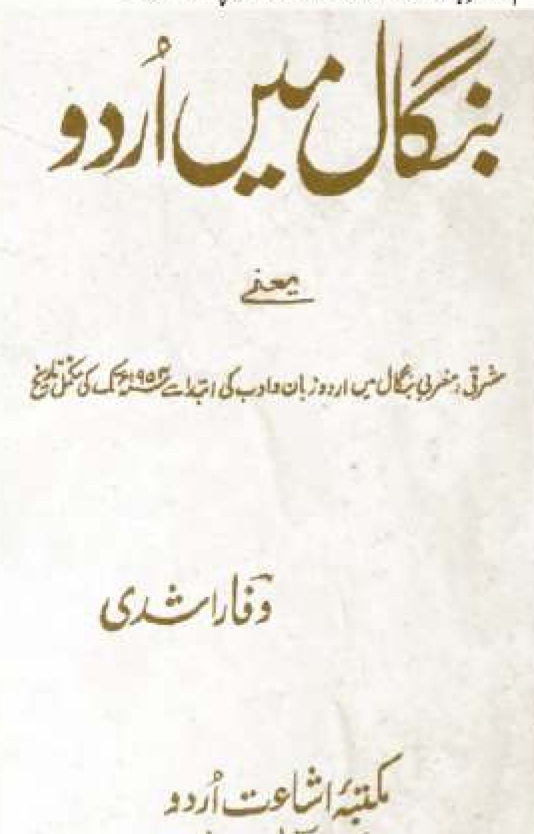

شرف النساء کی زبان میں سادگی، سلاست اور روانی ہے۔ آپ کی زبان دبستان مرشدآباد کی گھریلو زبان ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں مرشدآباد کے عوام کی زبان کا ایک معیار تھا اور محلات کی بیگمات کے علاوہ کنیزیں بھی اردو اور فارسی میں اچھی صلاحیت رکھتی تھیں۔

آپ کی مثنوی ''ہرمزنامہ'' ایک روایتی مثنوی ہے۔ آپ نے پرانی روایت پر چل کر اس مثنوی کی تخلیق کی ہے۔ اس مثنوی میں عام روایت کے مطابق پہلے حمد باری تعالیٰ میں شاعرہ رعب انسان ہے اور خدائے برتر کی تعریف میں خامہ فرسائی کرتی ہیں مثال کے طور پر کچھ اشعار دیکھیں:

لکھو نام اس کا وہ ہے نام پاک
ہے مرہم انھوں کو جو ہیں سینہ چاک

بیاں کس طرح ہووے اس کی صفات
نکلتی نہ بپت میں ہے منہ سے بات

مثالوں سے باہر ہے اس کی مثال
بیاں کس طرح ہووے حسن و جمال

ڈاکٹر محمد ہاشم نے اپنی کتاب'' مرشدآباد (مغربی بنگال) کی ایک نایاب مثنوی'' ہرمزنامہ'' میں لکھا ہے کہ'' یہ مثنوی تین سو سولہ صفحات پر مشتمل ہے اس مثنوی میں کل چار ہزار اکیس اشعار ہیں۔ مثنوی ہرمزنامہ تیرہویں صدی ہجری کی تخلیق ہے جیسا کہ خود مثنوی کی شاعرہ شرف النساء کہتی ہیں کہ

یہ تیرہ صدی اب زمانہ ہوا
کہ تمکی میں اپنا بیگانہ ہوا

(ص:31)

''ہرمزنامہ'' میرحسن کی مثنوی سحرالبیان کی طرز پر لکھی گئی مثنوی ہے۔ میرحسن کی مثنوی 1785 کا شاہکار ہے اور آپ کی مثنوی ہرمزنامہ 1838 کے بعد کی تخلیق ہے اور دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزارنسیم کی تصنیف 1837 میں ہوئی اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہرمزنامہ ہر دو مقبول مثنویوں کے بعد کی تحریر ہے۔ گلزارنسیم اور ہرمزنامہ دونوں ایک ہی عہد کی مثنویاں ہیں لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ایک ہی عہد میں دونوں مثنویاں لکھی گئیں۔ ''گلزارنسیم'' لکھنؤ میں لکھی جانے کی وجہ سے مشہور زمانہ ہوگئی اور دوسری دور دراز مشرقی ہندوستان کے دبستان مرشدآباد شہر میں لکھی جانے کی وجہ سے اور ایک خاتون کی تخلیق ہونے کے سبب گمنامی کی دلدل میں کھوگئی۔ ہاں اس بات کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ہرمزنامہ میں بہت سی خامیاں بھی ہیں لیکن ماحول کے حساب سے ان سب خامیوں کا ہونا لازمی تھا کیونکہ دبستان مرشدآباد کا ماحول بنگالی ہے اور

یہاں بنگالی زبان کا چلن زیادہ ہے اس لیے بنگالی زبان کا اثر ہونا فطری ہے۔شرف النساء بلند مرتبہ شاعرہ نہیں تھیں اس کا انھیں خود احساس تھا:

کہ نظم و نثر میں نہیں مجھ کو ڈھنگ
مگر میرے آقا جو ہیں صوبہ جنگ

اس لیے وہ خدا سے دعا بھی کرتی ہیں جو مندرجہ ذیل اشعار میں واضح ہے:

پڑی مہنگی غلطی میں شرف النساء
نظر تجھ کو اب تک نہ آیا خدا

خدا سے یہی ہے اے التجا
جو عاجز کہ تیری ہے شرف النساء

سحرالبیان، ''گلزارنسیم'' اپنے انداز بیان کی وجہ سے بہت زیادہ مشہور ہوئی۔آپ کی مثنوی ''ہرمزنامہ'' بھی سحرالبیان کے طرز پر لکھی گئی ہے۔بحر بھی وہی منتخب ہوئی ہے جس بحر میں مثنوی سحرالبیان نظم ہوئی ہے آپ نے صاف اور سادہ اسلوب اختیار کیا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ آپ کے یہاں روانی اور دلکشی نہیں پائی جاتی جو میر حسن کا خاصہ ہے۔آپ نے زبان اور بیان کا جادو نہیں دکھایا بلکہ سیدھی سادی زبان میں کہانی قلم بند کر دی اس لیے زبان میں بھی غلطیاں نظر آتی ہیں۔اس میں آپ نے ہندی کے بہت سارے الفاظ و محاورات کا استعمال کیا ہے۔کچھ املا کی بھی غلطیاں ہیں اور کچھ تذکیرو تانیث کی بھی کمیاں ہیں۔خاتون ہونے کی وجہ سے بہت سارے تجربات سے دور رہیں اور مشاہدات میں بھی کمی آئی۔ بہت سارے محاورات و استعارات سے روشناس نہیں ہوسکیں، فضا اور ماحول سے واقف نہیں ہو پائیں اس لیے ان سب خامیوں کا ہونا لازمی ہے۔لیکن زبان کی سلیس و سادگی کے معاملے میں آپ کہیں کہیں میر حسن کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔

مثنویوں کی طرح ہرمزنامے میں بھی آپ نے مکالمے پیش کیے ہیں ہر جگہ ماحول کے مطابق باتیں کی ہیں۔آپ نے ہندوستان اور خصوصاً بنگال کے سماجی پس منظر کا بھی خیال رکھا ہے اور وہاں کے خواصوں کے رسم و رواج پر بھی آپ کی گہری نظر ہے۔آپ نے عورتوں کے لباس اور زیورات کا بھی ذکر کیا ہے اس وقت ہندوستان میں جادو ٹونے ٹوٹکے کا بھی رواج تھا اس کی مثالیں آپ نے پیش کی ہیں۔آپ نے ہندی کے الفاظ جو اپنی مثنوی میں استعمال کیے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک لمبے عرصے سے ہندوستان میں قومی یکجہتی کا ماحول قائم تھا اور زبان کو لے کر کوئی تفریق نہیں تھا۔

اس مثنوی میں نئی بات یہ ہے کہ انسان پری پر عاشق نہیں ہوتا بلکہ جنوں کا بادشاہ ایک ارضی شہزادی پر عاشق ہوتا ہے اور ایک انسان کی مدد سے کامیاب ہوتا ہے۔انداز بیان سیدھا سادا ہے۔عربی الفاظ کی صحت کا خیال نہیں رکھا گیا ہے۔اکثر مثنویوں میں مخصوص موقعوں پر حیاسوز اور عریاں اشعار ملتے ہیں لیکن آپ نے اس موقع پر اختصار سے کام لیا ہے۔عریانی سے گریز کیا ہے۔

اس مثنوی میں آپ نے فارسی کے اچھے اچھے اشعار نقل کیے ہیں اس سے آپ کی شعر و شاعری کے ذوق کا پتہ چلتا ہے۔مثال کے طور پر ایک شعر ملاحظہ ہو:

سد ندوں عروساں چیں بے نشاں
نداند کے نام نشاں در جہاں

مگر ایسا نہیں ہے کہ آپ کی مثنوی میں صرف خامیاں ہی خامیاں ہیں اس میں بہت ساری خوبیاں بھی ملتی ہیں جیسے آپ نے تشبیہ اور استعارے سے کام لے کر مثنوی کو خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے پھر اس میں مقامی الفاظ و محاورات کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ان سب کی وجہ سے آپ کی مثنوی میں دلکشی پیدا ہوگئی ہے۔

صغرا سبزواری

سیدہ کنیز صغرا نام اور تخلص سبزواری ہے۔آپ کے والد کا نام سید غلام مہدی سبزواری اور والدہ کا نام رابعہ بیگم تھا۔آپ کی پیدائش 31 دسمبر 1917 میں ہوئی۔آپ کے دادا سید غلام رسول سبزوار ایران کے شہر نشاپور میں واقع سبزوار نامی علاقہ کے تھے یہی وجہ رہی ہے کہ وہ اپنے ناموں کے ساتھ سبزوار استعمال کرتے رہے ہوں گے اس نسبت سے آپ نے بھی اپنا تخلص سبزواری رکھا۔

1939 میں آپ کی شادی پروفیسر سید محمد طاہر رضوی سے ہوئی پر قسمت کا کھیل یہ رہا کہ طاہر صاحب کا ساتھ آپ کی زندگی میں صرف 8 سال تک ہی رہا۔1947 میں طاہر صاحب کا انتقال ہوگیا یہ وقت آپ کی زندگی کا سب سے کٹھن وقت تھا یا یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ دکھوں نے دستک دینی شروع کر دی تھی۔آپ کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔دو لڑکیاں تو عین جوانی میں داغ مفارقت دے گئیں۔آپ نے تمام آزمائشوں کا مقابلہ کیا۔آپ نے قلیل آمدنی میں وہ کارنامہ انجام دیا جو صرف آپ ہی کا خاصہ تھا۔آپ نے اپنے بچوں کی پرورش ایک باپ کی طرح کی اور باپ کی نامحرومی کا احساس تک نہیں

ہونے دیا۔ بہرکیف آپ کے کلام کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

شام فراق اپنی فروزاں نہ کر سکے
تاریک زندگی کو درخشاں نہ کر سکے
تھے اس قدر جدائی کے لمحات سوگوار
کچھ بھی تلافی غم ہجراں نہ کر سکے
تھی کشمکش حیات سے اس درجہ مضمحل
آخر علاج گردشِ دوراں نہ کر سکے
یورش غموں کی ایسی تھی مجھ پہ کہ الاماں
کچھ راز داری غم پنہاں نہ کر سکے
تھی اس قدر نوازش پیہم کہ الحفیظ
کچھ اہتمام وسعت داماں نہ کر سکے
اپنی ہی زندگی تھی کچھ ایسی خزاں نصیب
تم بھی ہمارے درد کا درماں نہ کر سکے

مندرجہ بالا غزل کے مطالعہ سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنی زندگی کس کرب سے گزاری ہوگی۔ پہلے شوہر کی جدائی پھر عین جوانی میں دولڑکیوں کی داغ مفارقت برداشت کرنا واقعتاً آپ کی حوصلہ افضائی کو سلام۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز 1926 میں افسانہ نگاری سے ہوا۔ آپ نے رابندرا ناتھ ٹیگور اور بنکم چندر چٹرجی کے علاوہ دوسرے مصنفین کے افسانوں کے ترجمے اردو میں کیے ہیں جو کہ مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آپ علامہ راشد الخیر کے مشہور رسالہ ''عظمت'' کی مستقل مصنفہ تھیں۔ آپ نے ایک ناول بھی لکھا ہے جس کا نام ''خواب و بیداری'' ہے۔ 9 افسانوں پر مشتمل آپ نے ''نورتن'' کے عنوان سے ایک مجموعہ شائع کیا۔ آپ نے 1931 میں شاعری شروع کی۔ آپ نے شاعری میں طاہر رضوی، پرویز شاہدی اور رضا کاظمی سے تلمذ کا شرف حاصل کیا۔ گرچہ آپ نے غزلیں کم کہیں ہیں لیکن اس مختصر کلام سے آپ کی شاعرانہ صلاحیت کا بخوبی پتہ چلتا ہے آپ کی ایک نظم ملاحظہ ہو:

میرے ساتھی اور اعزا سب عدم کو چل بسے
موت کی غفلت ہوئی طاری اچانک سو گئے
کیا بتاؤں آہ میری چشم کیوں پر آب ہے
ہم دموں کے درد فرقت کے سبب بے تاب ہے

آپ کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے آپ کی زندگی دکھ درد کا مجموعہ ہے جو آپ کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ بہر حال آپ نے ادبی خدمات کے علاوہ بے شمار سماجی و ملی خدمات بھی انجام دیں ہیں۔

سیدہ نسیم بیگم

دبستان مرشدآباد کی عظیم و نامور ہستیوں میں ایک اہم نام نسیم آرا بیگم کا ہے بیسویں صدی کے حلقہ خواتین میں جو مقام آپ کی شخصیت کو حاصل ہے وہاں تک شاید کسی کی رسائی نہیں ہوئی آپ ایک باادب اور مہذب گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ زندگی کے تقریباً ہر شعبے میں آپ نے اپنی ایک منفرد پہچان بنائی۔ آپ ایک مثالی شخصیت کی حیثیت سے ایک شاعر، ادیب، سماجی کارکن، سیاست داں اور نہ جانے کن کن صلاحیتوں کی مالک تھیں۔

آپ کا پورا نام نسیم آرا بیگم اور نسیم تخلص تھا۔ آپ کی پیدائش کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے اصغر انیس اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ:

''آپ کی پیدائش 1940 میں سراج الدولہ بازار محلہ میں ہوئی''۔ (ص۔258)

بزم ارباب ادب مرشدآباد کا ترجمان فروزاں میں مرشدآباد کے موجود قلمکار رقمطراز ہیں کہ:

''آپ کی ولادت 20 مئی 1948 کو مرشدآباد کے ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں چاروں طرف شعر و شاعری کا چرچہ تھا۔'' (ص۔27)

بہرکیف آپ کے والد سید جمشید قدر خورشید علی مرزا مرشدآبادی اچھے شاعر تھے۔ آپ کی والدہ کا نام شوکت آرا بیگم تھا جن کا تعلق خاندانِ مغلیہ سے تھا۔ آپ کی رہائش گاہ ڈیوڑھی کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ آپ اپنے والدین کی پہلی اولاد تھیں آپ کی ایک بہن اور ایک بھائی تھے۔ یوں تو والدین سارے بچوں سے محبت کرتے ہیں لیکن پہلی اولاد کی ممتا کچھ اور ہی ہوتی ہے یہی سبب ہے کہ آپ اپنے والدین کی چہیتی تھیں۔ حسب روایت ابتدائی تعلیم گھر پر ہی استاد فضل علی سے حاصل کی۔ اس زمانے میں دبستان مرشدآباد میں لڑکیوں کے لیے کوئی اسکول نہ ہونے کے سبب تعلیم کا سلسلہ بہت آگے تک نہیں جا سکا۔ آپ کو علم حاصل کرنے کا شوق بچپن ہی سے تھا تا ہم زندگی کے جس مرحلے میں آپ کو حصول علم کا موقع ملا آپ نے اسے ہاتھ سے نہیں گنوایا۔ گھر پر تو یوں ابتدائی تعلیم حاصل کی لیکن بعد میں جب انھیں ہندی زبان میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ہاتھ آیا تو آپ نے فاصلاتی نظام تعلیم کے تحت تعلیم حاصل کی اور اس طرح آپ نے مدھیامک پاس کیا۔ آپ کی

شادی 23 دسمبر 1954 کو آپ کے خالہ زاد بھائی جناب سید جانِ عالم مرزا سے ہوئی۔ آپ کی ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہیں۔ سماجی رکن کے طور پر بھی آپ کی پہچان تھی۔ خدا نے اگر گھرانہ رئیس بخشا تھا تو ان کو دل ویسا ہی فراخ بخشا۔ کوئی سوالی کبھی آپ کے در سے خالی نہیں جاتا تھا۔ دبستان مرشدآباد کا شاید ہی کوئی ایسا فرد ہو جو آپ کی شخصیت کو نہ جانتا ہو۔

آپ نے ایک ادبی اور مذہبی ماحول میں پرورش پائی۔ دبستان مرشدآباد میں دورانِ عزاداری اور ماتم دیرینہ روایت سے تحریک پا کر آپ نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز نوحہ و ماتم سے کیا۔

شاعری میں آپ اپنے ماموں سید ابرار حسین صنو سے اصلاح لیتی تھیں۔ رفتہ رفتہ شعر گوئی کا شوق پروان چڑھتا رہا اور ماتم نوحہ، سلام کے علاوہ غزل میں بھی طبع آزمائی کی۔

صنو نے جب ترک دبستان مرشدآباد کر دیا تو آپ نے آفاق مرزا آفاق کے سامنے زانوئے تلمذ کیا اور ان کی رہنمائی میں بہت تیزی سے شعری کمال حاصل کرنے لگیں اور پھر دبستان مرشدآباد میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کرنے لگیں۔ غزل کے میدان میں آپ نے خوب طبع آزمائی کی۔ نسیم آرا بیگم 25 فروری 2016 کو اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئیں۔

ریحانہ نواب

دبستان مرشدآباد کی شاعرات میں ایک اہم نام ریحانہ نواب کا ہے آپ دبستان مرشدآباد کے مشاعروں کی کامیاب شاعرہ ہیں۔ آپ کے مشاعرہ سے متعلق ''شہر شہر نمائش'' میں ڈاکٹر کلیم قیصر گورکھپوری فرماتے ہیں کہ:

> '' ریحانہ نواب جس طرح کی شاعری لے کر مشاعروں میں آتی تھیں وہ شاعری مشاعروں میں پیش کی جانے والی شاعری سے تھوڑی مختلف تھی۔ ان کے پڑھنے کا انداز بھی معیاری تھا اور غالباً ان کے مشاعروں میں ٹکے رہنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح کے اشعار سننے والے سامعین کی تعداد کم تو ضرور ہے مگر جتنی بھی ہے وہ باوقار اور اہل نظر کی تعداد ہے اس لیے ریحانہ نواب عوامی مشاعروں میں کم فٹ ہو پاتی ہیں۔ البتہ ان کے سننے والے شعر فہم حضرات کے مخصوص مشاعروں کی محبوب شاعرہ ہیں۔''

(ص۔18)

چمکی بجلیاں طوفان کا رخ صیاد کے تیور
یہ سب کچھ دیکھ کر بھی آشیاں چھوڑا نہیں ہم نے

شاعرات کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو مشاعروں میں اپنی مقبولیت درج کروانے میں پیش پیش ہیں اور دوسرا وہ جو اپنی تخلیقی ہنرمندی کی بنیاد پر نئے شعری رویوں سے ہم آہنگ ہو کر توجہ کی مستحق ہیں۔ ریحانہ نواب کا تعلق بلاشبہ پہلے طبقے سے ہے لیکن بعض اوقات اپنی شناخت کے لیے اعلیٰ انسانی قدروں اور تہذیبی روایات کے امتزاج کو اپنے فن کے آنچل میں باندھتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

آپ کا اصل نام ریحانہ بیگم اور تخلص ریحانہ ہے لیکن ادب کی دنیا میں آپ کی شہرت ریحانہ نواب کی حیثیت سے ہے۔ آپ کی پیدائش 31 اکتوبر 1958 میں مرشدآباد کے قلعہ نظامت میں ہوئی۔ والد کا نام سید صابر حسین مرزا اور والدہ کا نام سیدہ سلطانہ بیگم تھا۔ آپ کا تعلق مرشدآباد کے نظامت خاندان سے تھا۔ آپ کی پیدائش مرشدآباد میں ہوئی لیکن آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ میں گزارا۔ آپ نے گریجویشن خضر پور کالج سے مکمل کیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد تدریسی پیشہ کو ذریعۂ معاش بنایا۔ آپ کے والدین تعلیم یافتہ تھے اور ماموں سید عسکری مرزا شوکت کا شمار مرشدآباد کے معروف قلم کاروں میں ہوتا تھا۔ آپ نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولیں جہاں علم و ادب کی گونج ہر جانب سنائی دیتی تھی۔ اسی ادبی ماحول کی پرورش کا نتیجہ تھا کہ آپ میں بھی شعر گوئی کا شوق پروان چڑھنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان کی زندگی میں ماحول کا کافی اثر ہوتا ہے یہ بات ان کے ساتھ بالکل فٹ بیٹھتی ہے شہر کلکتہ نے بھی ان کی ادبی دنیا میں اہم رول ادا کیا ہے۔ کلکتہ میں دورانِ قیام بھی شہر میں جاری ادبی سرگرمیوں کا ان کی زندگی میں خوب اثر پڑا۔ حضرت احمد رئیس آپ کے استاد تھے۔ آپ کی شعری آبیاری مرشدآباد ہی میں ہوئی۔ آپ کی ادبی زندگی کا آغاز 1977 میں ہوا۔ کامیابی و شہرت کی منزلیں طے کرتے ہوئے آپ نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا آج بھی اپنے کلام سے لوگوں کے دلوں میں ایک مخصوص اور منفرد جگہ بناتی چلی آ رہی ہیں۔ اپنی خدا داد آواز کے ذریعہ بھی آپ کا مشاعروں میں خاصا اثر ہے۔

آپ نے سب سے پہلے کلکتہ میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی پھر آنے والے ایام میں کلکتہ کی سرحد پار کر کے ملک کے بیشتر حصوں کے مشاعروں میں شرکت کی۔ مشاعروں میں آہستہ آہستہ قدم جماتے جماتے آج بین الاقوامی مشاعروں میں آپ کا نام محتاج تعارف نہیں۔ اصغر انیس اپنی کتاب '' مغربی بنگال میں اردو کا ایک قدیم

مرکزِ مرشدآباد' میں لکھتے ہیں :

''مشاعروں کے سلسلے میں اندرون ملک مختلف شہروں کے علاوہ متعدد بیرونی ممالک کے سفر پر بھی رہیں ۔ جہاں شرکاء مشاعرہ سے داد تحسین بھی حاصل کیا۔'' (ص۔265)

کوئی آیا ہے یہ احساس ہوا ہے شاید
دل دھڑکنے کی ادا بھول گیا ہے شاید
بے رخی رسمِ محبت سے سوا ہے شاید
مشورہ ترکِ محبت کا بجا ہے شاید
تشنگی مے بھی نہ کر پائی سکوں کا ساماں
زندگی کا بھی نشہ ٹوٹ رہا ہے شاید
دل یہ کہتا ہے سورج کی کرن ناچے گی
عقل کہتی ہے کہ دن ڈوب رہا ہے شاید
کل مجھے دیکھ کے پہچان نہ پایا وہ بھی
مدتوں جب کہ مرے ساتھ رہا ہے شاید
مانگتے رہے ہیں ریحانہ کے زخموں کا علاج
بے وفائی کا یہ انداز نیا ہے شاید

ریحانہ نواب ہندوستان کی ایک معروف اور متحرک شاعرہ ہیں۔ آپ بنیادی طور پر غزل گو شاعرہ ہیں۔ آپ نے کثرت کے ساتھ غزلیں کہی ہیں آپ کے کلام کا مجموعہ ''شہر شہر نمائش'' کے عنوان سے 2013 میں منظرِ عام پر آیا جس میں غزل کے علاوہ حمد' نعت' منقبت' نظم' گیت' قطعات' سوز' سلام وغیرہ شامل ہیں ان کا ایک گیت ملاحظ کیجیے:

گیت :

کس سے بچھڑے' کب بچھڑے تھے یہ بھی نہ یاد آئے
بیتی باتیں سوچتی ہوں تو پاگل من گھبرائے
دنیا کے میلے میں اپنا کوئی نظر نہ آئے
سوچ رہی ہوں کون ہے ہارا، کس کی ہوئی ہے جیت
جان رہی ہوں سارے جہاں میں میری غزل کی دھوم
سن کے میرے ہر مصرعے کو وہ بھی رہے تھے جھوم
لیکن دل سے چاہنے والا کوئی نظر نہ آئے
اب میں غزلیں کیسے سناؤں ان میں نہیں سنگیت

آپ کی شاعری ہی آپ کی زندگی کا آئینہ ہے۔ جہاں ہمیں آپ کی حیات کے حوالے سے کھٹے میٹھے جذبات کی صداقت و احساسات ، زندگی کے تجربات و مشاہدات اور ماضی میں رونما ہونے والے واقعات و سانحات کی بازگشت صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ مثال کے طور پر کچھ اشعار مندرجہ ذیل ہیں :

وقتِ رخصت جو اثر تھا وہ اثر باقی ہے
کھل گئی آنکھ مگر خواب کا ڈر باقی ہے
مل گئے یوں تو ہمیں پھر در و دیوار نئے
گھر کے لٹ جانے کا احساس مگر باقی ہے
کیسے ٹوٹے گا ترے چاہنے سے رشتہ دل کا
جب تلک تیغ ہے تیری' مرا سر باقی ہے
شعر گوئی کے سوا کچھ نہ بچا ریحانہ
اب کہاں پاس مرے کوئی ہنر باقی ہے

آپ کی شاعری میں کوئی تصنع ہے نہ بناوٹ، نمائش کی جھلک ہے نہ خود پسندی کا اظہار ہے بلکہ جذبے کی صداقت ، احساسات ، تجربات و مشاہدات واقعات و سانحات کی گونج صاف سنائی دیتی ہے۔ آپ نے ایسے خیالات کو شعری پیراہن عطا کیے جو ایک ٹوٹی اور بکھری ہوئی عورت کے جذبات کی ترجمانی کر سکیں۔ آپ کی آپ بیتی ہر عورت کی آپ بیتی معلوم ہوتی ہے جسے حالات نے یار و مددگار جینے پر مجبور چھوڑ دیا ہے۔ ایسی عورتوں کی کرب ناکی کیا ہوگی آپ کے کلام میں محسوس کی جا سکتی ہے۔ احساسات و جذبات سے لبریز ان کے اشعار ملاحظ فرمائیں:

ابھی اندھیرے میں ہوں، روشنی سے ملنا ہے
جو مجھ کو بھول گیا ہے اُسی سے ملنا ہے

نہ دوستی سے نہ اب دشمنی سے ملنا ہے
ہاں، جس کو چھوڑ دیا تھا اُسی سے ملنا ہے

بہر کیف یہ بات قابلِ قبول ہے کہ دورِ حاضر میں ریحانہ نواب کو ادبی حلقہ میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ دبستان مرشدآباد کو آپ کی ذات اور آپ کی ادبی خدمات سے ڈھیر ساری امیدیں وابستہ ہیں۔

□□□

Syeda Jenifar Rezvi
C/o. Syed Shakil Raza
Village: Jublee Tank Lal Bagh
Distt. Murshidabad-742149 (W.B)

سید واصفہ غنی

اختر اورینوی کا افسانوی تنوع

اردو افسانہ نگاری میں ایک انوکھی شخصیت پروفیسر اختر اورینوی کی ہے۔ علم وفن کے شعبوں میں گراں قدر خدمات کی وجہ سے ان کی حیثیت ایک نابغہ کی ہے۔ ان کا دور سیاسی اور ادبی اعتبار سے انتشار اور تجربوں کا عہد تھا۔ اس زمانے میں کئی اہم افسانہ نگار نظر آتے ہیں جن میں کرشن چندر، منٹو، بیدی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اختر اورینوی ادب میں مقصدیت کے قائل تو ہیں لیکن ادب کے فنی حسن کو تبلیغ وتلقین کے لیے قربان کر دینا روا نہیں سمجھتے۔ اپنے مضمون میں وہ خود اعتراف کرتے ہیں:

''میں نے اپنی بساط بھر اپنی کہانیوں میں یہی کوشش کی ہے کہ کچھ کام کی بات خوبصورتی اور سلیقے سے کہہ جاؤں اور افسانہ نگار ہی رہوں کچھ اور نہ بن جاؤں۔''

(تحقیق وتنقید، اختر اورینوی، کتابستان، الہ آباد، ایڈیشن 1961، صفحہ166)

اختر اورینوی کے افسانوں کے چھ مجموعے ''منظر و پس منظر''، ''کلیاں اور کانٹے''، ''انارکلی اور بھول بھلیاں''، ''سمینٹ اور ڈائنامائٹ''، ''کینچلیاں اور بال جبریل'' اور ''سپنوں کے دیس میں'' شائع ہو چکے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ افسانوں سے انھیں جو ناموری حاصل ہوئی وہ تنقید کے علاوہ کسی اور ادبی میدان میں نہیں ملی۔ حیات وکائنات کے تمام مسائل و موضوعات پر انھوں نے افسانے لکھے اور اپنی بے پناہ تخلیقی قوت سے انھیں زندگی سے ہمکنار کیا۔

اختر صاحب کے افسانوں میں زندگی کے مختلف روپ اپنے حقیقی پیکر میں نظر آتے ہیں۔ دیہی اور شہری زندگی کو انھوں نے بہت قریب سے دیکھا اور زندگی کے ایک ایک گوشے کی تلاشی لی۔ اس لیے نفسیاتی بصیرت بھی ان کی کہانیوں کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ سماجی شعور کی غمازی کے لیے وہ اپنی کہانیوں کا مواد اپنے اردگرد سے حاصل کرتے ہیں۔ متوسط طبقے کی عکاسی چاہے وہ کلرک ہو، جونیر وکیل ہو، ٹائپسٹ ہو، اسکول ٹیچر ہو، بے روزگار گریجویٹ ہو، نرس ہو سب کے سب اقتصادی بدحالی کے شکار اپنے اپنے مسائل کی چکی میں پستے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا مشہور افسانہ ''آخری اکنی'' جدوجہد کرتے بے روزگار گریجویٹ کی کہانی ہے۔ ملک میں بیروزگاری اور افلاس کے پس منظر میں یہ افسانہ ہے۔ سہیل بی۔اے پاس کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ دو روٹی مل جائے اس کے لیے ہر محکمے کے وہ چکر لگاتا ہے جہاں اسے رسوائی اور پھٹکار ملتی ہے۔ غربت اور بیروزگاری نے اسے بھوکے سونے پر مجبور کیا۔ افسانہ میں کربناک منظر وہ ہے جہاں ''رنگون ہیر سیلون'' کا حجام بھی سہیل کی بیروزگاری اور افلاس پر طنز کر دیتا ہے:

''حضور آپ کی نوکری کب تک ہوگی؟ آپ پر زور دیتے

ہوئے سیلون کے حجام نے دریافت کیا۔ سہیل چونک پڑا.....مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا......''

(آخری اکنی، اختر اورینوی، کہانی کے روپ، مرتب وہاب اشرفی، پٹنہ، چوتھا ایڈیشن 1974، صفحہ 95)

بیروزگاری کے چکر میں آرزوئیں گھٹ گھٹ کر دم توڑ دیتی ہیں۔ سہیل کی جیب کی آخری اکنی سیلون والے کی نذر ہو جاتی ہے۔ وقار عظیم نے بجا لکھا ہے:

''جہاں کہیں اختر اورینوی نے اس نچلے طبقے کی زندگی کی مصوری کی ہے ان کے افسانے صداقت، فن اور افسانوی دلکشی کا مجموعہ بن گئے ہیں۔''

(نیا افسانہ، وقار عظیم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ 2، ایڈیشن 1982، صفحہ 175)

''ایک درخت کا قتل'' اختر اورینوی کا علامتی افسانہ ہے۔ ''ایک درخت'' دراصل گنگا جمنی تہذیب ہے جو ہند اسلامی تہذیب کی کوششوں کے بعد تناور درخت کی صورت میں پھلتا پھولتا دکھائی دیتا ہے۔ مشترکہ تہذیب کو حکمراں طبقے نے تعصباتی حملے کر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ درخت کی شاخیں کمزور ہیں اس کو ٹکڑے کرنے کی تدبیر میں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس درخت کی جڑیں بہت ہی طاقتور ہیں وہ اپنی جگہ برقرار رہتی ہیں جس سے نئی کونپلیں نکلنے لگتی ہیں۔ یہ افسانہ زندگی اور سماج کے مثبت رویوں کی علامت بن جاتا ہے:

''ہم لوگوں نے ٹھیکیداروں اور عملوں سے پرزور احتجاج کیا اور انھیں صاف صاف کہہ دیا کہ جڑ والا تنا ہرگز نہیں کٹے گا...... جڑ میں اب ہرگز ہاتھ نہیں لگانے دیا جائے گا......

دوسرے دن وہ لوگ تنوں کے افتادہ ٹکڑے لاد کر لے گئے۔

مجروح جریدہ تنا صبر، استقلال، اطمینان اور امید کے ساتھ کھڑا ہوا تھا اس کے بالائی پہلو میں سرسبز نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور کوارٹر کی چھتوں سے اونچی چند ہری بھری شاخیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔''

(بہار میں اردو افسانہ نگاری، مرتب وہاب اشرفی، بہار اردو اکیڈمی پٹنہ، ایڈیشن 1989، صفحہ 184)

اس افسانہ میں مشترکہ کلچر کے ساتھ جینے والوں کو طاقت ملتی ہے۔ کیونکہ شاخوں کے بکھر جانے سے درخت کا وجود ختم نہیں ہوتا۔ زمانے کی تلخیاں اور حکمرانوں کے خونی منصوبے بھی ہماری تہذیبی زندگی کے تقاضے باہمی ہمدردی اور مشترکہ کلچر کو پارہ پارہ نہیں کر سکتے۔ سید احتشام حسین نے ان کی خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

'ان کی کہانیوں میں سماجی شعور قلبی احساسات کی راہ سے داخل ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان مصنفوں میں گنے جاتے ہیں جو زندگی کی مصوری میں نفسیات سے کام لیتے ہیں۔''

(اردو ادب کی تنقیدی تاریخ، سید احتشام حسین، ترقی اردو بیورو نئی دہلی، ایڈیشن 1983، صفحہ 307)

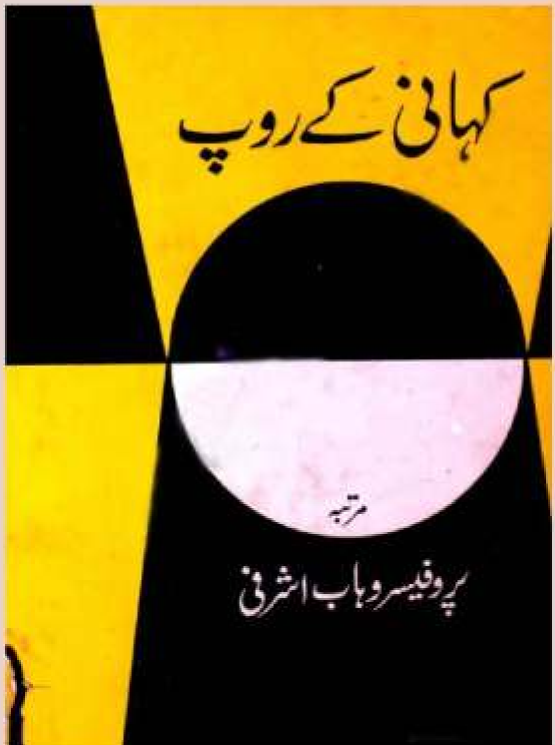

اختر اورینوی کا مشہور افسانہ ''محشر'' پلاٹ لیس اور شعور کی رو کی تکنیک پر مبنی ہے جو افسانے کے ہیئتی تجربے میں ایک استحکام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس افسانے میں ایک فنکار کی بے چینی، شدت کرب، کائنات کے المیہ انجام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو احساساتی سطح پر نہیں بلکہ جذباتی انداز میں شعور کی رو پر مشتمل ہیں۔ انسانیت کی بے حرمتی دیکھ کر حساس فنکار کے ذہن میں طوفان برپا ہے۔ وہ اپنے ذہن و دل کا سکون تلاش کرنے میں سرگرداں ہے۔ اس کے خلق کردہ مختلف کردار اس سے عالم خواب میں محو تکلم ہو جاتے ہیں اور فنکار کے سامنے مختلف مطالبے رکھتے ہیں۔ وہ ان کے سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ جب اس کی نیند ٹوٹتی ہے تو شہر میں کشت و خون کی درندگی دیکھ کر یاس و حسرت کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ افسانہ ''محشر'' کا یہ اقتباس دیکھئے:

"وجود جیسے فنا ہو رہا ہو...... شہر میں آتش زدگی کی وبا آئی ہوئی تھی۔ زندگی جل رہی تھی۔ انسانیت کے ساز و برگ خاکستر ہو رہے تھے۔"

(اختر اورینوی، سپنوں کے دیس میں، (مجموعہ) پٹنہ، ایڈیشن 1969، صفحہ 85)

"کلیاں اور کانٹے" اختر اورینوی کا طویل افسانہ ہے جس میں سینی ٹوریم کے پس منظر میں وہاں کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ ہی نہیں بلکہ ایک ماحول کی داستان ہے جس میں زندگی سے مایوس انسانوں کے بے شمار نقش ہماری نگاہوں کے سامنے محسوس ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی افسانہ نگار کی ذاتی زندگی کی محبتیں اور دیگر جذبے بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے تخلیق فن کے وقت فنکار ایک خاص کیفیت سے دوچار ہے:

"میں نے ڈولی کا ہاتھ پکڑ کر بہ رقت معافی مانگی وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی...... آخر کار میں اچھا ہو گیا چند ماہ اور سینی ٹوریم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی...... میں رخصت ہونے سے پہلے نرسوں سے ملنے گیا۔"

(اختر اورینوی، کلیاں اور کانٹے (افسانہ) اختر اورینوی کے افسانے، مرتب عبدالمغنی، پٹنہ، ایڈیشن 1977، صفحہ 122)

واقعات کی ترتیب و تنظیم میں اختر اورینوی ماہر ہیں۔ "کینچلیاں اور بال جبریل" میں انسان خواب میں ہی سرگزشت آدم کی ساری حقیقتوں سے روشناس ہوتا ہے اور حیات و کائنات کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ ابن آدم کے کرب کے ساتھ افسانہ نگار نے عہد حاضر میں انسانیت کے لیے پیدا شدہ خطرناک مستقبل کی طرف بھی اشارہ کیا ہے:

"اگر مجھے جوہر روح نہ ملا تو میں مادہ کی جوہر شکنی کر کے خدا کی کائنات کو فنا کر دوں گا اور خود بھی فنا ہو جاؤں گا۔"

(" " " کینچلیاں اور بال جبریل (افسانہ)" " " صفحہ 180)

"سپنوں کے دیس میں" شعور کی رو پر مبنی خواب و خیال کا افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بھی حکایت ہستی ہے۔ جس میں خالق کائنات خود خواب دیکھتا ہے اور حیات و کائنات کی تخلیق کے مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ انسان اس دنیا میں جس حالات سے دوچار ہے اس کا علم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی انسان کے تخریبی ذہن کی دھمک بھی سنائی دیتی ہے۔

"مگر جوہر مادہ تک رسائی مادیت کی شکست بھی تھی۔۔۔ کون جانے!...... برہما کی نیند دھماکوں سے اچٹ گئی تھی۔ سپنوں کا سنسار چھایا، خواب کی دنیا مایا!...... کیا عظیم دماغ انگڑائی لے کر جاگ اٹھے گا؟ کیا برہما اپنے سپنوں کا سنسار رچے گا۔"

(اختر اورینوی، سپنوں کے دیس میں (مجموعہ) پٹنہ، ایڈیشن 1969 صفحہ 72-73)

اختر اورینوی کے افسانوں کے مرتب ڈاکٹر عبدالمغنی نے "سپنوں کے دیس میں" اور "کینچلیاں اور بال جبریل" افسانوں کے متعلق اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

"افسانہ نگاری کی دنیا میں کسی ادیب نے اب تک یہ جرات اور اس سے زیادہ صلاحیت بہم نہیں پہنچائی تھی کہ تخلیق و تقدیر کے پیچیدہ و سربستہ اسرار کو اس فلسفیانہ تحقیق کے ساتھ افشاں کرنے کی کوشش کرے۔ فکر و فن دونوں اعتبار سے ان افسانوں کا امتیاز یہ ہے کہ ان میں اب تک کی معلوم تاریخ انسانی کے تمام حقائق کو سمیٹ لیا گیا ہے۔"

(عبدالمغنی، اختر اورینوی کے افسانے (مقدمہ) مرتب عبدالمغنی، پٹنہ، ایڈیشن 1977 صفحہ 19-20)

اختر اورینوی کا دائرہ فکر بہت ہی وسیع ہے۔ حیات و کائنات کے تمام مسائل و موضوعات ان کے افسانوں میں در آئے ہیں۔ ان کو جب افسانے کے کلاسیکی سانچے تنگ معلوم ہوئے تو ان کی جدت پسند طبیعت نے افسانے کے روایتی فارم کو وسیع کیا۔ ان کے تجرباتی نوعیت کے افسانوں میں محشر، سپنوں کے دیس میں، کینچلیاں اور بال جبریل، بجلی پیڑ، حدیں وغیرہ کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک نابغہ کی طرح انھوں نے افسانے کی روایتی ہیئت میں جدت پیدا کی جس کی وجہ سے ان کے بعض افسانے کلاسیکی ہیئت کی جکڑبندی سے آزاد نظر آتے ہیں۔ انتظار حسین، بلراج مینرا، انور سجاد، سریندر پرکاش وغیرہ کے حوالے سے آج اردو افسانوں میں جس رمزیت و علامتیت کے چرچے نئے افسانے کے ناقدین کر رہے ہیں اس کی مستحکم فضا اختر اورینوی کے افسانوں میں موجود ہے جو آج سے پہلے اس وقت لکھا گیا تھا جب نیا اردو افسانہ اپنے نئے بال و پر سے متعارف ہونے کے ابتدائی مرحلے میں ہی تھا۔ اس امر کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اختر صاحب کے افسانے اردو افسانے کے سفر کا سنگ میل قرار دیے جا سکتے ہیں۔

□□□

Syed Wasifa Ghani
Fellow, U. G. C
Dept. of Urdu
S.P. Jain College
Sasaram-821115 (Bihar)

قمرالنساء

اردو شاعری اور تصور زن

شہر کا تبدیل ہونا شاد رہنا اور اداس
رونقیں جتنی یہاں ہیں عورتوں کے دم سے ہیں

(منیر نیازی)

نرم و نازک مگر پہاڑوں کی طرح مضبوط، بلند حوصلوں اور عزائم کا مینار، اعلیٰ ذوق، سجنے سنورنے کا بے پناہ شوق، خوش اخلاق و خوش لباس، خوش گفتار و سلیقہ شعار، رحمدل، فیاض اور ملنسار، فرض شناسی کے جذبے سے سرشار، پرعزم و خود مختار، دلوں کو موم کرنے والی، اپنے خاندان عصمت و عفت کی نگہبان، اپنی خوشیوں کو قربان کرنے والی، فراخ دل، قابل اعتماد و جہد مسلسل کی عمدہ مثال، صبر و استقلال کا پیکر، وفا کی دیوی، شوہر کی معاون و مددگار، بچوں کی نگراں، باتوں کے فن میں ماہر، محبت کی پاسدار، شوہر کی وفادار، بے مثل قوت برداشت اور جس کے قدموں میں جنت اسی کا نام ہے عورت۔

عورت کے متعلق مختلف دانشوروں، فلاسفروں، ماہرین ادب نے مختلف نظریات پیش کیے ہیں:

مسلم شریف میں ہے کہ: ''ساری دنیا ایک متاع زندگی ہے اور دنیا کی بہترین متاع نیک عورت ہے۔''

بقول مولانا روم: ''عورت قدرت کا تبسم ہے جو انسانی روپ میں ظاہر ہوا ہے عورت نہ ہوتی تو یہ دنیا مکمل نہ ہوتی۔''

گاندھی جی کی نظر میں: ''عورت مرد کی غلام نہیں بلکہ اس کی بہترین رفیق، ہمدرد اور ساتھی ہے۔''

ہارک کا کہنا ہے کہ: ''ستارے آسمان کی نظمیں ہیں تو عورت زمین کی۔''

گوئٹے کا ماننا ہے کہ: ''عورت ایک خداداد تحفہ ہے جو جنت کے کھو جانے کی کمی پوری کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔''

اقبال کے الفاظ میں:

وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوز دروں

عورت کے متعلق مختلف آراء پیش کی جاتی رہی ہیں۔ کسی نے اس کی مخالفت میں کہا کہ عورت کم عقل ہے، تو کسی نے اسے ایک معمہ قرار دیا ہے، جس کو سمجھنے کے لیے عمر خضر درکار ہے، تو دوسری طرف اس کے مقام و مرتبے اور اس کی اہمیت اجاگر کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ حالی نے عورت کو خراج تحسین ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

اے ماؤ، بہنو، بیٹیو! دنیا کی عزت تم سے ہے
ملکوں کی بستی ہو تم ہی
قوموں کی عزت تم سے ہے

قدرت کی عظیم مایہ ناز اور شاہکار تخلیق عورت ہے اس کے دم سے کائنات میں رنگینی ہے اسلام نے اس کو دل میں جگہ دینے کا حکم دیا یعنی احترام کی چادر اوڑھا دی، تکریم کا لبادہ پہنا دیا، جنت کو اس کے قدموں کے نیچے رکھ دیا اور آدمی و انسانیت کی تعمیر کی ذمہ داری بھی اسی کو سونپی، یعنی اولاد کی تربیت اور گھر و خاندان کی حفاظت کا ذمہ دے کر ادب و شرف کے

منصب پر بٹھادیا۔حفیظ جالندھری کے الفاظ میں:

یہ ہماری مائیں بہنیں اور بیوی بچیاں
ہم سمجھتے ہیں انھیں اتنا مقدس بے گماں
اس قدر پاک اور مقدس اتنی محبوب وعزیز
جس قدر عورت کی عفت ہے نہیں ہے کوئی چیز

عورت مقدس و پاک ہستی ہے۔ وہ اپنے اندر حیا،وفا، سلیقہ، خوشبو، ہمدردی، نور، ایثار، عاجزی وانکساری کا پورا جہاں آباد کیے ہوئے ہے۔ شاد عارفی نے 'عورت' کی تخلیق پر''عورت'' کے عنوان سے ہی عمدہ نظم لکھی ہے کہ عورت کا وجوداس سرزمین پر کیسے وجود میں آیا:

پایہ تکمیل کو پہنچا جوں ہی یہ شاہکار
دست قدرت نے ٹٹولی نبض اس کی بار بار
بستر نکہت پہ یہ تتلی جو محوخواب تھی
مست انگڑائی کے ہاتھوں جاگ اٹھی شرما گئی
دیکھ کر شاعر نے اس کو نکتہ حکمت کہا
اور بے سوچے زمانے نے اسے عورت کہا

شاد عارفی نے اپنی نظم ''عورت'' میں جس طرح ایک عورت کا خاکہ بنایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔اس کا وجود جوان تمام انوکھے راستوں سے گزر کر اپنی منزل پر آ پہنچا ہے۔عورت ایک آسمانی تحفہ ہے عورت ایک چاند ہے جس کے حسن سیرت میں بھٹکے ہوئے کو راہ ملتی ہے۔عورت کی تخلیق پر ایک عمدہ نظم ملاحظہ فرمایئے:

مشیت کو ہوئی منظور جب تخلیق عورت کی
اشارہ پا کے یوں گویا ہوئی ہر چیز فطرت کی
زمین بولی ، الٰہی اس کو میری عاجزی دینا
فلک بولا اسے میرا مذاق سرکشی دینا
کہا سورج نے اس پر روشنی قربان کرتا ہوں
قمر کہنے لگا میں چاندنی قربان کرتا ہوں
پکاری کہکشاں اس پر میری بیداریاں صدقے
ثریا نے کہا میرا بھی تاج زرفشاں صدقے

کائنات کے ہر ذرے اور ہر شئے نے اس کے لیے اپنی جانب سے کچھ نہ کچھ عطا کیا زمین وآسمان، شمس وقمر، کہکشاں وثریا سب نے اپنے تئیں حصہ لیا اور اس مایہ ناز تخلیق کو وجود میں لانے میں گویا اہم رول ادا کیا۔

عورت خدائے بزرگ و برتر کی شاہکار تخلیق ہے زندگی کے اس وسیع وعریض کینوس میں رنگ بھرنے والی اور رنگوں کو جینے والی خود عورت ہے۔

بقول شاعر

اگر بزم ہستی میں عورت نہ ہوتی
خیالوں کی رنگین جنت نہ ہوتی
ستاروں کے دلکش فسانے نہ ہوتے
بہاروں کی نازک حقیقت نہ ہوتی

عورت خدا کا حسین تحفہ ہے دنیا کی تمام رونقیں عورت سے ہیں اور دین کی امانت بھی عورت ہے۔عورت کی گود انسان کا پہلا مکتب اور درسگاہ ہے۔یہ عصمت وعفت کا پیکر ہے۔رات کا تارا، صبح کا نور اور شبنم کا قطرہ ہے اندھیرے دلوں کو روشن کرنے والی عورت ہے۔

تو پریم مندر کی پاک دیوی تو حسن کی مملکت کی رانی
حیات انساں کی قسمتوں پر تری نگاہوں کی حکمرانی
جہان الفت تری قلمرو حریم دل تیری راجدھانی
بہار فطرت ترے لب لعل گوں کی دوشیزہ مسکراہٹ
نظام کونین تیری آنکھوں کے سرخ ڈوروں کی تھرتھراہٹ

(مجید امجد)

عورت گردش لیل ونہار کا ایک حسین اور کیف آور نغمہ ہے۔اعزاز ملت ہے غیرت وشرافت کی عمدہ مثال ہے۔خوبصورت عورت ہیرا ہے لیکن نیک سیرت اور بہترین اخلاق وکردار کی مالک عورت جواہرات کا خزینہ۔عورت اپنے شوہر کا نصف ایمان ہے اس کی زندگی کا نور اور دل کا سرور ہے۔مرد اگر دنیا کا سورج ہے تو عورت اس کائنات کا چاند،اگر مرد کو آنکھ تصور کیا جائے تو عورت اس کی بینائی ہے اور اگر پھول تصور کیا جائے تو عورت اس کی خوشبو ہے۔

عورت ایک نعمت ہے۔عورت ایک بیٹی ہے جو اچھے مستقبل کی امید ہے۔عورت ایک بیوی ہے جو خاوند کی خدمت گزار اور وفا شعار ہے۔عورت میں تخلیقی قوت قدرتی طور پر ودیعت کی گئی ہے اور وہ نسل انسانی کی پرورش کرتی ہے اس کے جذبہ ایثار کو مدنظر رکھتے ہوئے پیغمبر اسلام نے فرمایا۔

''جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔''

گویا عورت جنت کا نعم البدل ہے اللہ نے عورت کو ہر روپ میں بہت عمدہ تخلیق کیا ہے۔

عورت دور جاہلیت میں:

دور جاہلیت میں لوگوں کو عورت کا وجود نا قابل قبول تھا۔عورت کی

کوئی عزت نہ تھی بلکہ اکثر لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ عورت کی عزت نہیں تھی، لہو ولعب کی چیز، ہوس پرستی کا لازمہ تھی۔ وہ تماش بینی کا ذریعہ اور غیر ضروری فرد سمجھی جاتی تھی:

بقول حالی:

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر
تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھے شوہر کے تیور
کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی
جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

عورت عزت وعصمت کے نام پر قربانی دیتی آرہی ہے کبھی عزت کے نام پر، کبھی اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے، کبھی وفا کے لیے' کبھی حیا کے لیے۔ دور جاہلیت میں لڑکی کو زندہ دفن کیا جاتا تھا کبھی اس کی غیرت کو تار تار کیا جاتا تھا تو کبھی اس کے جذبات واحساسات کا خون کیا جاتا تھا۔

مشتاق علی شان کے الفاظ میں:

اپنے گم گشتہ زمانے کی کتھا لائی ہوں
کون جانے میرا نوحہ ہے کہ رجز نامہ
اپنے مہکے ہوئے زخموں کی قبا لائی ہوں
جبر کی دھوپ میں بہتا ہوا افسانہ ہے

دور حاضر کی عورت:

غضب کا حوصلہ اللہ نے عورت کو بخشا ہے
کہ جتنی مشکلیں آتی ہیں ہمت اور بڑھتی ہے

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اسلام میں وہ مقام عطا فرمایا جو اس سے پہلے رائج نہیں تھا۔ دور بدلتا رہا اور ہر دور کے تقاضے بھی بدلتے رہے۔ آج عورت نے 21 ویں صدی میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ آج کی عورت تعلیم یافتہ ہے وہ مرد کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کر آگے بڑھ رہی ہے۔

مرد کے لیے تعلیم حاصل کرنا جس قدر ضروری ہے عورت کے لیے اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اگر ماں زیور تعلیم سے آراستہ ہوگی تو وہ نسل نو کی تربیت بہتر طور پر کر سکتی ہے۔

نپولین کا قول ہے کہ:

''تم مجھے اچھی مائیں دو میں تمھیں اچھی قوم دوں گا''۔

آج کی عورت تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف ہے۔ عورت تعلیم یافتہ ہوگی تو زمانے کی اونچ نیچ کو بخوبی سمجھ سکے گی اور نہ صرف خود اپنی زندگی بہتر طریقے سے گزارے گی بلکہ گھر کا ماحول بھی خوبصورت بنائے گی۔

حالی اور اقبال نے عورت کی حیثیت کو معاشرے میں جس طور پیش کیا اور ان کی اہمیت بتائی پورا عالم ان کا ممنون ہے۔ ان کو محسن نسواں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اقبال قوموں کی تاریخ اور ان کے ماضی وحال کو ان کی ماؤں کا فیض قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

عورت ماں کے روپ میں شفیق، بہن ہو تو مہربان، بیوی ہو تو حیا، بیٹی ہو تو ہمت کا ساماں ہے جو کبھی حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت زینبؓ، کے روپ میں قوموں کے مقدر کو سنوارتی رہی تو کبھی رضیہ سلطان، چاند بی بی اور جھانسی کی رانی کے روپ میں قوموں کے مقدر کو چار چاند لگاتی رہی۔ طرابلس کی فاطمہ عبداللہ جس کے بارے میں اقبال نے ایک نظم لکھی:

فاطمہ تو آبروئے امت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

کارگاہ حیات خواہ کوئی میدان ہو کوئی شعبہ انجمن ہو عورت نے اپنے عزائم اور حوصلوں سے اپنی پہچان بنائی ہے اور اپنی صلاحیتوں کے تابندہ نقوش مرتسم کیے ہیں۔

بعض خواتین ایسی بھی ہیں جو اپنی ہمت وحوصلے سے معاشرے میں تبدیلی لا رہی ہیں۔ آج ہمیں ضرورت ہے اپنے عہد زریں کا مطالعہ کریں اسلام نہ تعلیم کے خلاف ہے نہ عورت کی ترقی کے، اسلام حکم دیتا ہے جو بھی کام کرو حدود شرع میں رہ کر بس ہمیں ان اصولوں پر عمل پیرا ہو کر زمانے کے ساتھ چلنا ہے۔

عورت کی عظمت

چلتی پھرتی ہوئی آنکھوں سے اذاں دیکھی ہے
میں نے جنت تو نہیں دیکھی ہے ماں دیکھی ہے

(منور رانا)

عورت کے بارے میں ازل سے لکھا جا رہا ہے اور ابد تک لکھا جاتا رہے گا۔

عورت پاؤں کی جوتی نہیں بلکہ دل کی ملکہ ہے اس کا ادب و احترام مرد کی نسبت تین چوتھائی زیادہ ہے۔

میں اکثر سوچتی ہوں کہ عورت کا حقیقی روپ کیا ہے۔ وہ

کیسا وجود ہے۔ جس کی پیدائش پر معاشرہ خوش نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے وہ پورے معاشرے میں خوشیاں بانٹتی ہے۔ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر بھی سب کو خوشیاں دیتی ہے۔ جب وہ ماں باپ کے گھر ہوتی ہے تو ان کی وفادار ہوتی ہے ان کے لیے دعائیں کرتی ہے جب شادی ہوتی ہے تو شوہر کی وفادار بن کر ساری زندگی، اس کی لمبی عمر کی دعائیں مانگتی ہے۔ جب وہ ماں بنتی ہے تو باقی زندگی بچوں کی پرورش اور ان کی تربیت کرنے میں گزار دیتی ہے۔ اولاد چاہے فرمانبردار ہو یا نہ ہو وہ انھیں دعائیں دیتے نہیں تھکتی۔

ان ساری حقیقتوں کے باوجود عورت کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ جہاں پیدا ہوتی ہے وہ باپ کا گھر کہلاتا ہے بیاہی جائے تو شوہر کا گھر اور جب بوڑھی ہو جائے تو بیٹے کا گھر۔۔۔۔ اگر اس کا کچھ اپنا ہوتا ہے تو فقط ایک قبر۔۔۔۔ لیکن حقیقت کیا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عورت کے بغیر کوئی گھر گھر نہیں ہوتا۔ وہ چار سو محبت، اپنائیت اور مسکراہٹیں بکھیرتی ہے۔ اسی لیے کوئی گھر عورت کے بغیر گھر کہلانے کے قابل نہیں ہوتا۔

یہ کامیابیاں عزت یہ نام تم سے ہے
خدا نے جو بھی دیا ہے مقام تم سے ہے
تمھارے دم سے ہیں مرے لہو میں کھلتے گلاب
مرے وجود کا سارا نظام تم سے ہے

عورت ایک عظیم ہستی ہے جو ہر رشتہ خلوص دل سے نبھاتی ہے عورت کو آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا لیکن وہ ہر کسی کے مزاج کو سمجھتی ہے۔ ہر ایک کی پسند و ناپسند کا خیال رکھتی ہے۔

یہ قول مشہور ہے کہ ہر کامیاب آدمی کے پیچھے عورت کا ہاتھ ہوتا ہے یہ بات بالکل سچ ہے کہ اگر عورت اپنی اولاد کی صحیح تربیت نہ کرے اور اچھے کاموں میں اپنے شوہر اور بچوں کی حوصلہ افزائی نہ کرے تو دنیا بڑے بڑے آدمیوں اور کارناموں سے خالی ہو جائے گی۔

علامہ اقبال جیسے مفکر اور عظیم شاعر کو اپنی ماں کی تربیت پر ناز تھا اور وہ اپنی تمام تر کاوشوں، شاعری کی مقبولیت اور ایمانی ذوق کو اپنی ماں کی تربیت کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ مسولینی جیسا عظیم مفکر اور دانشور صرف ایک اخبار کا مدیر ہوتا اگر اس کی ماں اس کے اندر ایک خاص روح نہ پھونک دیتی۔ ایران کی شاخ نکہت جس کا عاشق ایک طرف ایران کا بادشاہ تھا تو دوسری طرف ایک شاعر بھی۔ اور اس شہزادی نے تخت و تاج ٹھکرا کر اس غریب سے شادی کر لی اور یہی شاعر حافظ شیرازی کے نام سے دنیائے ادب میں اب تک زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا۔

اس کیوں کا جواب یہ معاشرہ ہے۔ جس نے آج تک عورت کو اس کا وہ مقام دینے کی کوشش نہیں کی جس کی وہ مستحق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک اور قوم ترقی کرنے کے بجائے ہر شعبہ ہائے زندگی میں تنزلی کا شکار ہے۔ عورت زندگی میں کئی بار مرتی ہے کئی بار جیتی ہے جو عشق و وفا، دکھ و سکھ اور ہجرت کا حسین امتزاج ہے:

طاہرہ مسعود نے کن خوبصورت الفاظ میں عورت کی عظمت بیان کی ہے ملاحظہ فرمائیں:

حیا و فا خلوص جس کا نام عورت ہے
ہوئی وجہ نبی کا سلام عورت ہے
اسی کے قدموں میں رکھی خدا نے جنت ہے
ملا ہے جس کو یہ اعلیٰ مقام عورت ہے
کبھی یہ سیتا، کبھی آسیہؑ کبھی مریمؑ
خدیجہؓ، فاطمہؓ، ہے جس کا نام عورت ہے
یہ عائشہؓ بھی ہے حاجرہؑ بھی اس کا نام
بسایا ہے جس نے بیت الحرام عورت ہے
ہے ختم اس پر ایثار و قربانی
مدرٹریزا ہے جس کا نام عورت ہے

اس کی عظمت جاننے کے لیے کسی سرٹیفکیٹ کی ضرورت نہیں کسی عمرانی اور سائنسی علم، کسی کیمیاگر، کسی سائنسدان، کسی نیوٹن کی تھیوری ثابت کرنے کسی دم دار ستارے، کسی کہکشاں پر جانے کی ضرورت نہیں۔ عورت خود ایک بڑا کائناتی استعارہ ہے۔ کشش ثقل کی عظیم لہر ہے۔ سمجھتا اس بات کو ہے کہ عورت ہر حال ہر روپ میں ہر رشتے کی اضافیت میں عظیم ہے اور روشنی و توانائی کا منبع و مرکز ہے۔ ''عورت کیا ہے'' شبنم رومانی کے اشعار دیکھیے:

عورت کیا ہے؟ گل تر
کب تک قید رہے گی بوئے گل کی نازک پنکھڑیوں میں
عورت کیا ہے؟ ساز کی دھڑکن
کب تک دھڑکن بند رہے گی ساز کی سیمیں تاروں میں
عورت کیا ہے؟ پیار کی جوگن
کب تک پیار کی جوگن یوں رسوا ہوگی بازاروں میں

عورت کیا ہے؟ ایک پہیلی
لیکن یہ رنگین پہیلی بوجھنے والا کوئی نہیں۔
عورت کے دل کو پہچانو
شبنم! جیسے دل میں انگاروں کی دنیا سوتی ہے۔
عورت کو مجبور نہ جانو
ہر مجبوری کی اے یارو! آئینہ ایک حد ہوتی ہے۔

آخر میں عورت کی عظمت کا اعتراف ان الفاظ میں کرنا چاہوں گی کہ کائنات ارضی ایک البم ہے اور عورت اس البم کی سب سے حسین تصویر ہے۔ اسی سے حیات کے رنگ نکھرتے ہیں۔ گلوں پر شباب آتا ہے شاعروں کے نغموں میں لطف پیدا ہوتا ہے۔ مصور کے قلم میں جان آتی ہے۔ ایوان حیات سج جاتے ہیں تاروں کو ضیا ملتی ہے، عورت بہار کا حسین روپ ہے، ستاروں کا نور ہے، اور سورج کی تاب، چاند کی خنک ہے، پھول کا نکھار ہے، بلبل کا ترنم ہے، کوئل کی کوک ہے، نہروں کی روانی ہے، کلیوں کی مہک لے کر پیدا ہوئی ہے، آنکھ کی ٹھنڈک ہے، دل کا سرور ہے، زخموں کا مرہم ہے، دکھوں کا مداوا ہے، تنہائی کی ہمدم و رفیق ہے غنچوں کی مسکراہٹوں اور گلوں کی مہک ہے، تنہائی میں رفیق ہے تو محفل کی رونق ہے، جلال و جمال کا حسین امتزاج ہے، وفا کی مورت ہے، عاجزی وانکساری کا پیکر ہے۔ مصیبت میں معاون ہے اور نسل انسانی کے بقا کی ضامن ہے۔

□□□

Qamrun Nisa
Research Scholar
Dept. of Urdu & Persian
Gulbarga University
Gulbarga-585106 (Karnataka)

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................. بتاریخ..............................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/100 روپے IFSC: SYNB0009009، A/C: 90092010045326 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....
پتہ : ....
....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

انجم آرا

محمد علوی اور ان کی نظمیں

محمد علوی اردو کے جدید شاعروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے غزل کو جدید اسلوب اور طرز اظہار عطا کیا اور اسے نئے عہد کے جمالیاتی تقاضوں اور لسانی حسیت کے مطابق اپنی شاعری کو نئے سرے سے ڈھالا اور شاعری کو ندرت فکر و اسلوب کے ذائقے سے آشنا کیا۔ اسی لیے ان کے پہلے شعری مجموعے 'خالی مکان' کو اردو میں جدیدیت کا باقاعدہ پہلا مجموعہ کلام قرار دیا گیا۔

''خالی مکان'' کی نظموں کا گہرائی سے مطالعہ کرنے پر علوی کے شاعرانہ ذہن کی کئی جہتیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہ خالی مکان بالکل نیا نیا سا ہے۔ اس کا در، اس کے دریچے، اس کی دیواریں، اس کی چھت، اس کا رنگ و روغن غرض ہر چیز نئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس مجموعے میں شامل نظموں کی لفظیات، ان کا لہجہ، ان کی تکنیک ان کا صوتی آہنگ نیا اور تازہ ہے۔ موضوعات کو پیش کرنے کا انداز اور زاویہ نیا اور پیش رو شاعروں سے مختلف ہے۔ ان کی نظموں میں کائنات کی ہر چیز بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور زندگی کی توانائی سے بھرپور رقص میں مصروف ہے۔ ان نظموں میں انسان، اجزائے فطرت اور تمام مخلوقات سے ذہنی اور جذباتی طور پر مربوط اور وابستہ محسوس ہوتا ہے۔ دھوپ، چاندنی، ہوا، تنہائی، رات علوی کی نظموں میں زندہ ہو کر انسان کے وجود کا حصہ بن جاتے ہیں۔ زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات، چھوٹی چھوٹی خوشیاں، بظاہر غیر اہم واقعات اور مناظر میں بھی شاعر معنی اور معنویت تلاش کر لیتا ہے:

رات کو جاگا تو دیکھا چونک کر
میرے کمرے میں کھڑی تھی چاندنی
اور کھڑکی کی سلاخیں آہنی
چار سو بکھری پڑی تھیں فرش پر (چاندنی)

علوی اپنے آس پاس کی چیزوں کو اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ہنستے بولتے ہیں اور ان کا درد محسوس کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیر سے حقیر چیز بھی اہمیت و وقعت رکھتی ہے کیونکہ وہ ان کی کائنات کا حصہ ہے اور اس کے بغیر ان کا وجود ادھورا ہے۔ ان کے آس پاس بکھری ہوئی چیزیں ان کے بصری کینوس پر چلتے پھرتے زندگی کی توانائی سے بھرپور پیکر بن جاتی ہیں۔ اس طرح معمولی سے معمولی منظر بھی ان کے مشاہدے میں آ کر پر معنی بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''رستے میں ایک گاؤں'' ملاحظہ ہو:

چھ یا سات پرانے گھر آپس میں مل کے بیٹھے تھے

اک ٹوٹے پھوٹے چھکڑے میں ایک دو کتے اونگھ رہے تھے
پیپل کے ایک پیڑ کے نیچے کچھ بھینسیں خاموش کھڑی تھیں
دو چیلیں سوکھے کھیتوں پر پر پھیلائے تیر رہی تھیں
دھول اڑائے جاتا تھا رستہ کچا
کار کے پیچھے بھاگ رہا تھا اک بچہ

مندرجہ بالا نظم اردو کے روایتی نظمیہ ڈھانچے سے مختلف ہے۔ اردو شاعری کے جمالیاتی پیمانے اور ہئیتی اصولوں کی پاسداری یہاں نہیں ہے۔ چھ سات پرانے گھروں کا مل کر بیٹھنا، دو کتوں کا اونگھنا، کھڑی بھینسوں اور اڑتی چیلوں اور کار کے پیچھے بھاگتا ہوا اک بچہ مل کر ایک ایسے منظر کی تخلیق کرتے ہیں جس میں روایتی شعری حسن تو نہیں ہے مگر گاؤں کے یہ سارے اجزا مل کر ایک بصری پیکر کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہی محمد علوی کی شاعرانہ انفرادیت ہے۔

''گھر'' علوی کی شاعری میں اگر مرکزی نہیں تو خصوصی اہمیت کا حامل ضرور ہے۔ ''گھر'' اور ''مکان'' علوی کے شعری ڈکشن کا حصہ ہیں۔ علوی کی شعری کائنات نامعلوم کہکشاؤں دور افتادہ سیاروں اور بسیط خلاؤں میں نہیں بلکہ ان کی زمین، ان کے گھر، گلیوں اور دیواروں پر بستی ہے۔ وہ انسان کے روزمرہ کے تجربات، اس کے احساسات اور اس کے دکھ سکھ کو سادگی سے پیش کر دیتے ہیں۔ اکثر ان کا درد دنیا کا درد بن جاتا ہے۔

علوی کے یہاں زندگی کے تئیں رویہ بھی روایتی شاعری سے مختلف ہے۔ یاسیت اور قنوطیت علوی کی شاعری میں نہیں ہے۔ ان کے یہاں حزنیہ اور المیہ فضا بھی نہیں ہے جو ان سے پیشتر شاعر ناصر کاظمی کے یہاں ہے۔ محمد علوی جدید دور کے شاعر ہیں اور جدید دور کا انسان انتہائی مصروف اور سخت جان ہے۔ اسے اپنے زخموں پر رونے کی فرصت نہیں ہے۔ وہ غموں کو پی کر زندگی کے مختلف تقاضوں کو پورا کرنے کے عمل میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے یہاں روحانی جذبات ہیں مگر ان کا اظہار مصنوعی رومانی فضا میں نہیں ہوتا ہے بلکہ اسی گھر کے ماحول کے پس منظر میں ہوتا ہے جہاں وہ اپنے سکھ دکھ کے لمحے کاٹتا ہے:

دیواریں دروازے دریچے گم صم ہیں
باتیں کرتے بولتے کمرے گم صم ہیں
پاس پڑوسی ملنے آنا بھول گئے
برتن آپس میں ٹکرانا بھول گئے
مٹو بی بی روٹی دو کہتا ہی نہیں
سونی سیج پہ دل بس میں رہتا ہی نہیں
تم کیا بچھڑے سمے سہانے بیت گئے
لوٹ آؤ میں ہارا لو تم جیت گئے

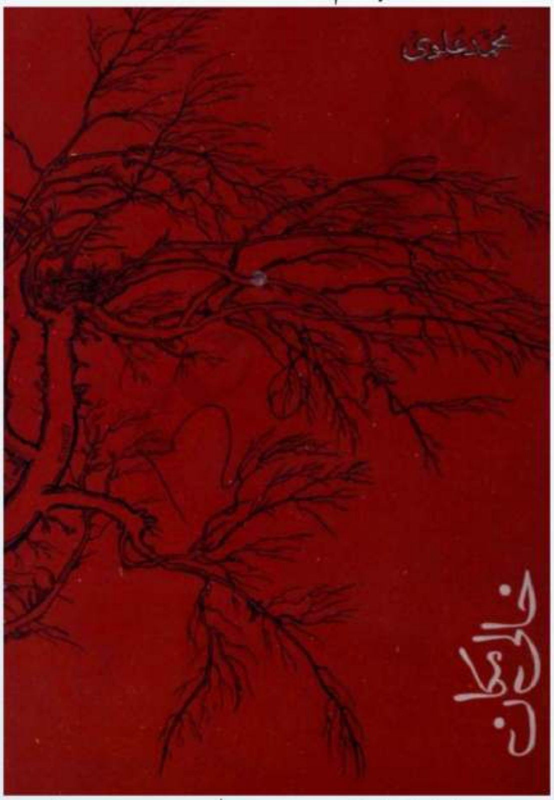

معشوق کے فراق میں بیتے ہوئے لمحوں کا بیان روایتی لفظیات اور پیکروں کی بجائے بالکل غیر رومانی اور کھردرے لہجے میں ہوا ہے جس میں نئی قسم کی حقیقت نگاری ہے۔ وہ اپنے رومانی جذبات کے اظہار کے لیے ایک رومانی اور طلسمی فضا کی تخلیق نہیں کرتے بلکہ انھیں آس پاس جو منظر نظر آتا ہے اسے ہی اپنی ذہنی کیفیت کی غمازی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور بے لوث ہے۔ وہ اشیا اور مظاہر فطرت کو کسی طے شدہ زاویئے سے نہیں دیکھتے بلکہ ایک نو وارد کی آنکھ سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ معلوم میں بھی نامعلوم کو دیکھ لیتے ہیں۔ وہ خوشنما پھول میں بھی سیاہ پتھر کی خوشبو محسوس کر لیتے ہیں۔ وہ تخلیق کی خوشبو زنگ آلودہ توپ کے دہانے میں بھی پالیتے ہیں:

ایک زنگ آلودہ
توپ کے دہانے پر
ننھی منی چڑیا نے

گھونسلہ بنایا ہے (تخلیق)

اسی لیے محمود ایاز نے ''خالی مکان'' کے دیباچے میں لکھا تھا کہ:

''علوی دراصل آنکھ اور احساس کے شاعر ہیں۔ان کے تجربات زیادہ تر بصری ہیں۔ان کی شاعری ایک تاثر پذیر، تازہ اور غیر مشروط unconditioned ذہن کی شاعری ہے۔ان کے یہاں فکر کا زیادہ عمل دخل نہیں ہے۔''

(پیش لفظ محمود ایاز، خالی مکان، محمد علوی، ص 1، مکتبہ سوغات، دہلی، 1963)

علوی کی دوسری نظموں ''تلاش''، ''آنکھ''، ''میرا امنا''، ''گڑیوں کا بیاہ''، ''پگڈنڈی'' وغیرہ میں بھی علوی کے اظہار کی یہی معصومیت کارفرما ہے۔ان نظموں سے علوی کی فکری کائنات، زندگی اور کائنات سے متعلق ان کے نظریے اور فلسفے، ان کا شعری رویہ اور شاعری کی تشکیل میں زبان کے رول سے متعلق ان کے اپروچ کا خاصہ علم ہوتا ہے۔ انھوں نے شعوری طور پر فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ اور تراکیب سے پرہیز کیا ہے اور اردو شاعری کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے حسب ضرورت ہندی اور انگریزی کے الفاظ اور علاقائی الفاظ بھی برجستگی سے استعمال کیے ہیں اور شعری جمالیات کے پرانے پیمانوں کو توڑ دیا ہے۔ انھوں نے اس مفروضے کو غلط ثابت کر دیا ہے کہ بڑی شاعری کے لیے عربی وفارسی زبانوں میں مہارت ضروری ہے۔ گوپی چند نارنگ علوی کی شعری زبان پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بظاہر محمد علوی کج سجاؤ چلتے ہیں۔وہ اس معنی میں اہل زبان بھی نہیں جس معنی میں بعض لوگ شعر گوئی کے لیے ''اہل زبان'' ہونے کو شرط مان لیتے ہیں اور نتیجتاً روایتی شعر کو منتہا سمجھ لیتے ہیں۔محمد علوی ہندوستان کے شمال مغرب کی طرف واقع صوبہ گجرات میں احمد آباد کے باشندے ہیں۔ لامحالہ گجراتی بھی بولتے ہوں گے۔ان کا لسانی کوڈ یک زبانی نہیں دو زبانی ہے۔ان کی اردو میں جو رس، لوچ اور گھلاوٹ ہے اس کا کچھ نہ کچھ لاشعوری رشتہ گجراتی زبان سے بھی ہوگا۔''

(مقدمہ، گوپی چند نارنگ، رات ادھر ادھر روشن، اردو ساہتیہ اکادمی گجرات، گاندھی نگر، 1995)

''خالی مکان'' کی نظمیں علوی کی شاعری کے تشکیلی دور کی نظمیں ہیں اور ان میں علوی کے مستقبل کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔انھوں نے زبان کو اپنے شعری اظہار کے وسیلے کے طور پر اپنایا خود کو زبان اور اس کے بندھے ٹکے سانچوں کا پابند نہیں کیا۔انھوں نے نظم کی صنف کو آزادی سے استعمال کیا۔

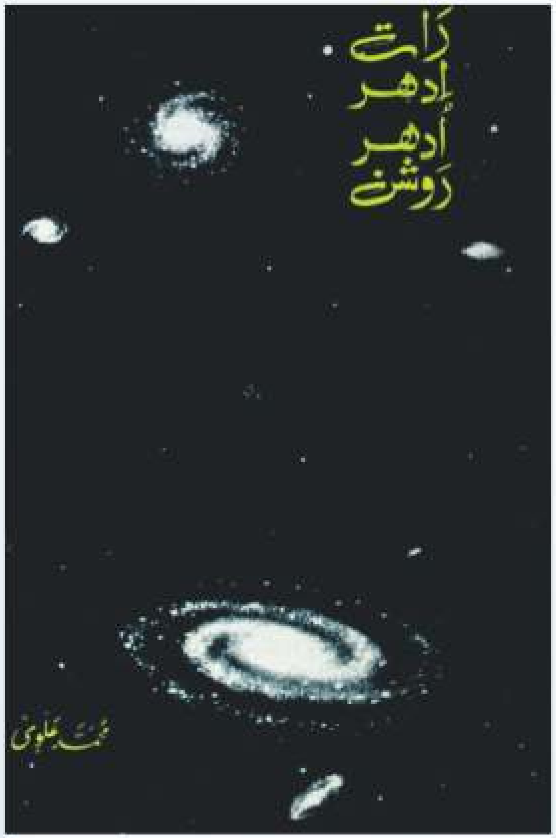

علوی کی نظموں میں کھردری حقیقتوں کے بیان کے ساتھ ساتھ خواب ناک کیفیتوں کا بھی بیان موضوعات کے لحاظ سے ملتا ہے۔رات، نیند، خواب، چاند، نیم عریاں حسین اپسرائیں، بھوت وغیرہ ایک پراسرار طلسمی فضا کی تخلیق کرتے ہیں۔'رات اور چاند ستارے'، خواب کا جزیرہ، نیند کا شہر، وغیرہ ایسی ہی نظمیں ہیں۔

لہٰذا، یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ محمد علوی نے اردو میں نظمیہ شاعری کو جدید لب ولہجہ اور نیا سانچہ عطا کیا جس کی بدولت اردو نظم جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے قابل ہوئی۔علوی کی نظموں نے اپنے اسلوب، لفظیات اور تکنیک کی سطح پر اردو شاعری میں ایک نئے دور کا آغاز کیا۔

□□□

Anjum Ara
Research Scholar
Dept. of Urdu
Kolkata University-700 073 (W.B)

شگفتہ پروین

خواجہ احمد عباس

اپنے افسانوں کے آئینے میں

خواجہ احمد عباس ادب کی دنیا کا ایک اہم نام ہے۔ اس اہم درخشاں ستارہ نے ادب کی دنیا میں اس وقت آنکھیں کھولیں جب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی ایک لمبی قطار موجود تھی۔ منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی جیسے بڑے فنکار اپنی غیر معمولی ذہانت اور تخلیق کے ذریعہ عظمت وشہرت کے جھنڈے بلند کر رہے تھے۔ ان افسانہ نگاروں نے ادب کو خواب کی دنیا سے باہر نکال کر حقیقت کی دنیا میں داخل کیا۔ جس کی بدولت رومان کی جگہ حقیقت کو ترجیح دی جانے لگی۔ گویا اس تحریک نے اہم کارنامے انجام دیے۔ جس سے ادب کو بہت کم وقت میں کافی فائدہ حاصل ہوا۔ ایسی ہی عظیم شخصیت تھے خواجہ احمد عباس۔ ان کا تعلق اردو کے سب سے پہلے نقاد اور اعلیٰ درجے کے شاعر خواجہ الطاف حسین حالی کے خاندان سے تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں آنکھ کھولنے اور پرورش پانے والے خواجہ احمد عباس کو ایک اہم فنکار بننے میں اس روایت سے کافی مدد ملی۔ ان کے وسیع مطالعے اور خاندانی ماحول نے ان کے تخلیقی ذہن کے دریچے کو کھولنے میں اہم رول ادا کیا۔

خواجہ احمد عباس کو ادب کے کسی مخصوص خانے میں محدود کرنا ناانصافی ہوگی۔ انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کی خاطر صحافت، فلم، کہانی، افسانہ، ناول، ڈرامہ وغیرہ کا سہارا لیا جس کے ذریعے وہ اپنی بات کو آسانی کے ساتھ عوام تک پہنچا سکتے تھے۔ وہ ہندی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں کے متعدد اخبارات سے وابستہ تھے اور ہفت روزہ بلٹز کے آخری صفحے پر آزاد قلم کے نام سے لکھتے رہے۔ خواجہ صاحب کے مختلف النوع خیالات کو کسی ایک شعبے تک محدود کرنا زیادتی ہوگی۔ اس سلسلے میں وہ خود رقم طراز ہیں کہ:

> ”میں خواجہ احمد عباس کہانی کار، ادیب، صحافی، فلم ساز اور ہدایت کار کے روپ میں پل پل جیتا رہتا ہوں۔ کتنی بار سوچا ہے کہ خود کو کسی ایک سانچے میں فٹ کرلوں تاکہ یہ شب وروز میرے اپنے ہو جائیں۔ لیکن یہ دیکھ کر اور سوچ کر میری نسل نے جس ادبی، ثقافتی، سیاسی اور سماجی انقلابی بنیاد رکھی تھی وہ ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے، میں نے خود کو علاحدہ علاحدہ شعبوں میں تقسیم کر دیا ہے کیونکہ جب انقلاب آتا ہے تو وہ زندگی کے صرف ایک شعبے میں نہیں آتا، وہ زندگی، سیاست، ادب، صحافت، کلچر، زبان، ثقافت اور معاشیات کے

مختلف النوع پہلوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتا ہے۔"

یہ کہنا بجا ہوگا کہ خواجہ صاحب نے ادب کی دنیا میں قدم صحافت کے ذریعہ رکھا لیکن طالب علمی کے زمانے سے ہی افسانوی ادب پر ان کی گہری نظر تھی۔ بقول خواجہ احمد عباس کہ "ابابیل" کے ذریعے وہ کوچۂ صحافت سے کوئے ادب میں داخل ہوئے۔ ان کا پہلا افسانہ "ابابیل" ہے جو جامعہ دہلی سے 1937 میں شائع ہوا۔ اس کہانی کو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا اور بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔ جرمنی میں دنیا کی بہترین کہانیوں کا ایک انتخاب شائع کیا گیا جس میں ہندوستان سے تین کہانیاں لی گئیں جس میں خواجہ احمد عباس کی کہانی "ابابیل" بھی شامل تھی۔ اس طرح خواجہ صاحب کی ادبی زندگی کی ابتدا ان کے شاہکار افسانہ "ابابیل" سے ہوئی۔ یہ ان کی پہلی تخلیقی کاوش تھی۔

انھوں نے تقریباً گیارہ افسانوی مجموعے اردو ادب کو دیے ہیں جو اپنے مخصوص زبان و بیان، سادہ و شیریں اسلوب اور ہمہ جہت موضوع اور تکنیک کے لحاظ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ خواجہ احمد عباس کے تخلیق کردہ اہم افسانوی مجموعے مندرجہ ذیل ہیں:

ایک لڑکی، پاؤں میں پھول، زعفران کے پھول، میں کون ہوں، دیا جلے ساری رات، گیہوں، گلاب اور پیرس کی ایک شام، کہتے ہیں جس کو عشق، چراغ تلے اندھیرا، پیار کی پکار، بیسویں صدی کے لیلیٰ مجنوں، نیلی ساڑی وغیرہ۔

خواجہ احمد عباس نے افسانوی ادب کے اس ارضی رجحان کی تقلید کی جس کے ذریعے معاشرے کو بہتر بنانے کی جستجو کی جاتی ہے ادب کے توسط سے زندگی کو آئینہ دکھانا جس کا مقصد ہے، بھوک، افلاس، کسان، مزدور، کھیت، معاشرے کے فرسودہ نظام، سیاست ان کے افسانوں کا اصل محور رہا ساتھ ہی ان کے افسانے ان کی ادبی اور شخصی زندگی سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ انھوں نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہی نہیں تھا بلکہ اسے پرکھا بھی تھا اور زندگی کے مسائل کا سامنا بھی کیا تھا۔ وہی فنکار کسی بھی میدان میں سبقت حاصل کرسکتا ہے جو اس کی جڑ تک پہنچ چکا ہو۔ اسے پرکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود ہو۔ خواجہ صاحب کے اندر یہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ بھلے وہ اس دنیا سے کوچ کر گئے لیکن اپنے کارناموں کی بدولت آج بھی دنیائے ادب میں اردو افسانہ نگاری کی حیثیت سے ان کا اہم مقام ہے۔

خواجہ احمد عباس فطری انسان سے زیادہ معاشرتی انسان کی تصویر کشی کرتے ہیں اور اس تصویر کشی میں ظلم کے خلاف ان کا سیاسی نقطۂ نظر نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ "زعفران کے پھول" میں کشمیر کی سیاست اور ظلم و تشدد کے نظریے کا ذکر ہے۔ اسی طرح "چڑے اور چڑیا کی کہانی" میں سیاست کی جعل سازی اور چال بازی کو بے نقاب کیا ہے۔ "ایک لڑکی سات دیوانے" میں موجودہ سیاست کی بے راہ روی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

سماجی نوعیت سے متعلق خواجہ صاحب کے افسانوں میں 'میرا بیٹا میرا دشمن' بہت ہی اہم ہے۔ اس افسانے میں جہاں ایک طرف انقلابی جدوجہد کا عکس نظر آتا ہے تو دوسری طرف مادرانہ شفقت کا شدید احساس چھپا ہوا ہے کہ کس طرح باپ بیٹے کی جدائی میں تڑپ رہا ہے اور یہ بیماری صرف کسی ایک باپ کی نہیں بلکہ پورے سماج کی ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس کے ذریعے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے:

> "بیٹا آنند کے چلے جانے کے بعد کرشن چندر کو محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ اس دنیا میں بالکل اکیلے ہیں۔ اب ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ لیکن اچانک انھیں یاد آتا ہے کہ ابھی تو ان کا باپ ہرنام سنگھ جو گاؤں میں رہتا ہے زندہ ہے۔ وہ کار نکالتے ہیں اور اسی امید کے ساتھ باپ سے ملنے گاؤں کی طرف چل دیتے ہیں کہ جب وہ اپنے باپ ہرنام سنگھ کو اپنے اکلوتے بیٹے کی اس سلوک کی داستان سنائیں گے تو ان کا باپ

ان سے ہمدردی کرے گا۔لیکن اس کے برخلاف ہوتا ہے
کیونکہ ہرنام سنگھ خودان کی جدائی کے باعث پاگل ہو چکا ہوتا
ہے۔وہ مایوس ہوکر واپس لوٹ جاتے ہیں انھیں یہ محسوس ہوتا
ہے کہ دیوان خانے کی ہر چیز کسی کی منتظر ہے۔''

اسی طرح 'نیلی ساڑی'، 'آسمانی تلوار' اور 'بھولی' میں سماجی برائیوں اور بھید بھاؤ کو بے نقاب کرنے کی بھر پور کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً ان کا افسانہ ''بھولی'' میں بھولی ایسی معتوب اور ستم خوردہ عورت ہے جو چیچک کے مرض کی وجہ سے خوبصورت سے بدصورت ہوگئی ہے۔ وہ اب نہ تو قبول صورت رہی اور نہ اس کے والدین کے پاس اتنا پیسہ تھا کہ وہ کسی کو جہیز کا لالچ دے کر اس سے بیاہ کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ دوسری طرف بھولی کا خوددار ضمیر بھی کسی لالچی شخص کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ بشمبر ناتھ پانچ ہزار روپے جہیز کی صورت میں لے کر شادی کے لیے تیار ہوتا ہے تو بھولی عمر دراز بشمبر ناتھ سے شادی رچانے سے انکار کر دیتی ہے۔

''پتاجی اٹھایئے اپنے پانچ ہزار مجھے اس سے بیاہ کرنا منظور نہیں۔''

''بھولی۔ اری کم بخت کیا کہہ رہی ہے۔ ماں باپ کی ناک کاٹنا چاہتی ہے کیا۔ کچھ تو ہماری عزت کا خیال کر۔''

''تمھاری عزت کی خاطر میں اس بڈھے لنگڑے سے بیاہ کرنے کو تیار تھی۔ مگر اس لالچی کمینے سے شادی نہیں کروں گی، نہیں کروں گی، نہیں کروں گی۔ وہ یہ لفظ دہرائے جا رہی تھی جیسے اس پر ہسٹیریا کا دورہ پڑ گیا ہو۔''

مندرجہ بالا اقتباس پڑھ کر سماج کے فرسودہ نظام کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا درست ہوگا کہ خواجہ صاحب نے اس افسانے کے ذریعے ان مذہبی روایات اور سماجی توہمات پر سخت تنقید کی ہے جو محض عورتوں کو اپنا تختۂ مشق بناتے ہیں۔

فسادات کے موضوع پر لکھے گئے افسانوں میں جنتا، رفیق مارا گیا اور 'میری موت' ہے اس موضوع سے متعلق 'میری موت' یادگار افسانہ ہے۔ افسانہ میری موت ابتدا میں ''سردار جی'' کے نام سے شائع ہوا تھا اور اسے بے حد مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ لیکن جب یہ افسانہ ہندی میں ترجمہ کر کے شائع کیا گیا تو مخالفت کی گئی بعد میں خواجہ صاحب نے ''میری موت'' کے نام سے شائع کرایا۔

ترقی پسند تحریک کے رہنماؤں کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ رومانی افسانے تخلیق نہیں کرتے ہیں، ان کے یہاں محبت کی رنگینی دیکھنے کو نہیں ملتی۔ وہ اپنے افسانوں میں ہمیشہ بھوک، افلاس، غربت، بے کاری کو ترجیح دیتے ہیں لیکن عباس کے کئی ایسے افسانے ہیں جو ترقی پسندی سے الگ ہیں مثلاً شکر اللہ کا، مسوری، نئی برسات، ہنومان جی کا ہاتھ، نیلی ساڑی، دیا جلے ساری رات، 'کہتے ہیں جس کو عشق' ان افسانوں کو سامنے رکھتے ہوئے بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب کے یہاں صرف انقلابی، سیاسی وسماجی رجحان نہیں بلکہ وہ رنگینی ورعنائی بھی موجود ہے جو انھیں صف اول کا افسانہ نگار تسلیم کرنے پر ہمیں مجبور کرتی ہے۔

یوں تو ناقدین کی رائے میں خواجہ احمد عباس صرف صحافی ہیں افسانہ نگاری ان کے بس کی بات نہیں۔ مگر مشہور و معروف ادیب کرشن چندر کے اس قول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ:

''عباس جاہلوں، جذباتیوں اور اعتقاد پرستوں کے افسانہ نگار نہیں ہیں وہ افسانہ نگاروں کے افسانہ نگار ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ماضی اور حال سے آگے جا کر مستقبل کی تعمیر سے متعلق زیادہ سوچتے ہیں۔ ان کا ادب صنعتی انقلاب کے فروغ کا ادب ہے اور جوں جوں ہندوستان میں اس انقلاب کو تقویت حاصل ہوگی عباس کی تحریروں کی تابانی بڑھتی جائے گی اور اگر کبھی مخالف انقلاب آیا فسطائیت کے اندھیرے نے ہمیں گھیر لیا تو عباس کی تحریریں سب سے پہلے جلائی جائیں گی۔''

(کرشن چندر، تعارف، پاؤں میں پھول، ص:2)

اس طرح خواجہ احمد عباس نے متعدد افسانے تخلیق کر کے اردو ادب کے دامن کو وسیع کیا۔ ہر ان موضوعات کو اپنے افسانوں کا محور بنایا جس کے ذریعے ایک اچھے سماج کی تشکیل کی امید کی جا سکتی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے موضوعات پر اہم اور اثر انگیز افسانے لکھ کر ترقی پسند افسانہ نگار ہونے کا فریضہ بھی انجام دیا۔ گویا خواجہ صاحب نے ادب کے بیشتر میدان کو ہاتھ لگایا اور عمدہ نقوش چھوڑ کر اپنی شناخت قائم کی ہے لیکن ان کی شہرت اور مقبولیت کا راز افسانوں میں مضمر ہے۔

□□□

Shagufta Parween
F-675, 3rd Floor, Back Side
Nearby Nargis Masjid
Jaitpur Part 2, Khadda Colony
Badarpur,New Delhi-110044

خواجہ عبدالمنتقم

خواتین ریزرویشن بل کی قانونی حیثیت

پارلیمنٹ میں خواتین کو 33 فیصدی ریزرویشن دینے سے متعلق بل یعنی آئین (108ویں ترمیم) بل، 2008 (2008 کا بل تعدادی 30)، جسے راجیہ سبھا نے 9مارچ 2010 کو منظوری دے دی، 1996 سے 2016 کا 20 سالہ طویل سفر کرتے ہوئے ابھی راہ سفر کی پہلی منزل تک ہی پہنچا ہے۔ ابھی اسے آخری منزل تک پہنچنے کے لیے نہایت پر پیچ راستے سے گزرنا ہوگا۔ اس سے قبل کہ اس بل کی مختلف مجوزہ دفعات اور متن کا تجزیہ کیا جائے قصۂ مساوات مرد وزن کے نقطۂ آغاز کی جانب رجوع کرنا ہوگا یا یہ کہیے کہ کیا ''چشمۂ مساوات'' میں ایسا کوئی پیمانہ ہوسکتا ہے جہاں 33 کو 67 کے برابر کہا جاسکے یا 100 کا نصف 50 کی بجائے 33 ہوتا ہو اور وہ 33 بھی مختلف زمروں سے تعلق رکھنے والی خواتین میں اس طرح بانٹا جائے کہ پہلے سے ہی محروم طبقات کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہو۔

اقوام متحدہ کے ذریعے منظور کیا گیا 1948 کا انسانی حقوق کا عالمگیر اعلامیہ اور اس کے تحت تیار کیے گئے مختلف بین الاقوامی منشوروں میں عام مساوات کی بات کہی گئی تھی لیکن سیاسی میدان میں مساواتِ مرد وزن کی باقاعدہ شروعات خواتین کے سیاسی حقوق سے متعلق کنونشن، 1952 کی شکل میں ہوئی جس کی دفعہ 2 میں واضح طور پر یہ بات کہی گئی ہے کہ خواتین ایسے تمام عوامی اداروں کے، جن کے لیے انتخاب کرائے جاتے ہیں اور جنھیں قانون کے ذریعے قائم کیا جاتا ہے، انتخابات میں بغیر کسی امتیاز کے مردوں کی طرح مساوی شرائط پر حصہ لینے کی حقدار ہوں گی۔ اس کنونشن کو مزید تقویت خواتین کے ساتھ کسی بھی طرح کا امتیاز ختم کرنے سے متعلق کنونشن، 1979 جس کا نفاذ 3 ستمبر 1981 کو ہوا اور جسے دنیا CEDAW کے نام سے جانتی ہے، سے حاصل ہوئی۔ اس کی دفعہ 3 میں یہ کہا گیا ہے کہ فریقین مملکتیں، خواتین کی مکمل ترقی اور فروغ کو یقینی بنانے کے لیے سبھی میدانوں میں خاص کر سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی میدانوں میں، ممکنہ مناسب اقدام، جن میں قانونی اقدام بھی شامل ہیں، اس غرض سے کریں گی کہ خواتین کو مساوات مرد وزن کی بنیاد پر انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کے استعمال

اور ان سے مستفید ہونے کی اجازت دی جا سکے۔ اس کے بعد اس ضمن میں مختلف ممالک میں کماحقہ، پیش رفت تو نہیں مگر بات آگے ضرور بڑھی اور مختلف ممالک نے مساوات مردوزن کو یقینی بنانے کے لیے مختلف قانونی اقدامات کیے۔ یہ بل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کسی بھی ملک میں اگر کوئی قانون بنایا جاتا ہے اور اس کا فائدہ وہاں کی اقلیتوں کو نہیں پہنچتا اور اس سے ان کے کسی بھی طرح حقوق بشمول سیاسی حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے یا ان حقوق سے انھیں محروم رکھا جاتا ہے یا ایسے اقدام نہیں کیے جاتے کہ ایسے قانون کا فائدہ اقلیتوں کو بھی پہنچے تو ایسا قانون اقوام متحدہ کے اقلیتوں سے متعلق 1992 کے کنونشن، جس پر خود ہندوستان نے بھی دستخط کیے ہیں، کے اس اعلان کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے جس میں واضح طور پر یہ بات کہی گئی تھی کہ نسل، جنس، زبان یا مذہب کی بنیاد پر بغیر کسی امتیاز کے سبھی کے لیے انسانی حقوق اور بنیادی آزادیوں کا احترام کیا جائے گا اور یہ کہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو عوامی زندگی میں موثر طور پر حصہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔ نہ صرف یہ بلکہ اس سے آئین کی دفعہ 14 کی بھی خلاف ورزی ہوگی جس میں حق مساوات کی ضمانت دی گئی ہے اور ساتھ ہی یہ دفعہ 15 کی روح کے خلاف ہوگا جس میں دیگر باتوں کے ساتھ ساتھ جنس کی بنا پر کسی بھی طرح کے امتیاز کی ممانعت کی گئی ہے۔

متذکرہ بالا ترمیمی بل میں آئین کی دفعہ 330 کے بعد 330A اور دفعہ 332 کے بعد دفعہ 332A شامل کرنے کی بات کہی گئی ہے تاکہ اول الذکر کے ذریعے لوک سبھا میں خواتین کو 33 فیصدی ریزرویشن دیا جا سکے اور آخر الذکر کے ذریعے ریاستی اسمبلیوں میں بھی ان کے لیے 33 فیصد نشستیں محفوظ کی جا سکیں۔ اگر کسی بھی ریاست یا یونین علاقے کے تعلق سے محفوظ نشست صرف ایک ہے تو 3 لوک سبھا الیکشنوں کے ایک بلاک میں پہلے الیکشن میں یہ نشست درج فہرست ذاتوں/قبائل سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے ریزرو ہوگی لیکن اس کے بعد 2 الیکشنوں میں ان کے لیے کوئی سیٹ ریزرو نہیں ہوگی۔ اگر محفوظ نشستیں 2 ہیں تو پہلے 2 عام انتخابات میں ایک نشست درج فہرست ذاتوں/قبائل سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے ریزرو ہوگی البتہ دونوں متذکرہ بالا انتخابات میں خواتین کے لیے وہی حلقۂ انتخاب ریزرو نہیں ہوگا اور تیسرے عام انتخاب میں ان زمروں سے تعلق رکھنے والی خواتین کے لیے کوئی بھی نشست محفوظ نہیں ہوگی۔ ان نشستوں کو بھی Rotation کے ذریعے یعنی باری باری سے الاٹ کیا جائے گا۔ اس طرح اس بار الیکشن لڑنے والوں کو اس بات کا یقین نہیں ہوگا کہ وہ آئندہ سال وہاں سے الیکشن لڑ سکے گا یا نہیں۔

یہ بات تو رہی کچھ اہم دفعات کی۔ ابھی تو اس بل کو قانونی شکل اختیار کرنے کے لیے کئی اور منازل طے کرنی باقی ہیں۔ یہ بل وہی پارٹی پاس کرا سکتی ہے جس کی اس ایوان یعنی لوک سبھا میں اکثریت ہے۔ علاوہ ازیں اس بل کو دونوں ایوانوں میں پاس کرانا ضروری ہے اور وہ بھی اسی شکل میں کیونکہ ایسے معاملے میں جوائنٹ سیشن کی اجازت نہیں۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی۔ اس بل میں مجوزہ باتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اور مذکورہ بالا دفعات 330A اور 332A کو آئین میں شامل کرنے کے لیے آئین میں دفعہ 368 کے مطابق ترمیم کرنی ہوگی۔ دفعہ 368 ہی

پارلیمنٹ کو آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار دیتی ہے۔ پارلیمنٹ اس آئین کی توضیعات میں اضافہ، تبدیلی یا تنسیخ اس دفعہ میں طریقۂ کار کے مطابق ہی کرسکتی ہے۔ اس آئین کی ترمیم کی تحریک اس غرض سے پارلیمنٹ کے کسی ایوان میں صرف بل پیش کرکے ہوسکے گی اور جب وہ ہر ایک ایوان سے اس ایوان کی جملہ رکنیت کی اکثریت سے اور اس ایوان کے ایسے ارکان کی کم سے کم دوتہائی اکثریت سے منظور ہوجائے جو موجود ہوں اور ووٹ دیں (اس کو صدر کے پاس پیش کیا جائے گا اور وہ بل کو منظور کرے گا) اور تب آئین اس بل کی توضیعات کے مطابق ترمیم شدہ قرار دے دیا جائے گا لیکن اگر ایسی ترمیم سے پارلیمنٹ میں ریاستوں کی نمائندگی میں کوئی تبدیلی کرنا مقصود ہو تو اس ترمیم کے لیے اس بل کو صدر کے پاس منظوری کے لیے پیش کرنے سے قبل کم سے کم نصف ریاستوں کی مجالس قانون ساز کی توثیق بھی لازمی ہوگی۔ اگر کسی خاص مدعے پر سیاسی جماعتوں میں اتفاق رائے بھی ہوجائے لیکن اس رائے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے آئین میں ترمیم کی ضرورت ہو تو بھی آئین کی ترمیم دفعہ 368 کے مطابق ہی کی جاسکتی ہے۔

آئیے اب اس بل کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر غور کریں۔ اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ یہ خواتین کو تو کم از کم سیاسی میدان میں مردوں کے برابر لانے کے لیے ایک مثبت پیش رفت ہے۔ خواتین کا آبادی کے اعتبار سے فیصد ہر ملک میں کم وبیش 50 فیصد ہے مگر صرف 33 فیصد خواتین کو ریزرویشن دینے کی تجویز انھیں بااختیار بنانے کی اچھی پیش رفت ہے۔ یہ صورت ہمارے ملک کی ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی موجودہ صورت حال ہرگز ہرگز اطمینان بخش نہیں۔ جرمنی اور نیدرلینڈ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں ان کا فیصد صرف 5 ہے جب کہ پاکستان میں 22 فیصد اور نیپال میں 33 فیصد کی گنجائش ہے۔ شاید قارئین کو یہ بات جان کر حیرت ہوگی کہ روانڈا جیسا ملک جو نسل کشی جیسی آفات کا سامنا کرچکا ہے وہاں پر خواتین کی نمائندگی 58 فیصد ہے۔ یہ بات دیگر ممالک کے لیے نہ صرف باعث شرم ہے بلکہ قابل تقلید بھی ہے۔ آج کی اس مہذب دنیا میں بھی خواتین کا کام میں حصہ 66 فیصد ہے لیکن دنیا کی کل آمدنی میں ان کا حصہ 10 فیصد ہے اور دنیا کی کل جائیداد میں ان کا حصہ صرف ایک فیصد ہے۔ یہ بظاہر ایک کہانی سی معلوم ہوتی ہے لیکن جب پروفیسر ڈنڈوتے نے اب سے تقریباً ایک دہائی قبل یہ بات بسنت لیکچر آف تھیوز وفیزیکل لیکچر میں کہی تھی تو لوگوں نے دانتوں کے نیچے انگلیاں دبالی تھیں۔ آج کی صورت حال قدرے بہتر ہوسکتی ہے۔

اس بل کے کچھ منفی پہلو بھی ہیں مثلاً اس مرتبہ الیکشن لڑنے والے کو اس بات کا یقین نہیں ہوگا کہ وہ دوسرا الیکشن یہاں سے لڑپائے گا یا نہیں اس لیے وہ اپنے حلقۂ انتخاب کے لیے کیے جانے والے کاموں میں اتنی دلچسپی نہیں لے گا جتنی کہ وہ اس صورت حال میں لیتا جب وہ اس بات کے لیے پرامید ہوتا کہ وہ آئندہ بھی اسی حلقۂ انتخاب سے الیکشن لڑے گا۔ اس کے علاوہ آج سیاستی بدعنوانی کو دور کرنے کی جو کوششیں ہورہی ہیں اس سے اس عمل کو بھی دھکا پہنچے گا چونکہ منتخب نمائندہ اس بات کی پرواہ نہیں کرے گا کہ جو کچھ وہ کررہا ہے آئندہ ہونے والے انتخاب میں لوگ اس سے اس کا حساب مانگیں گے۔ اس سے خود احتسابی اور بیرونی احتسابی دونوں عملوں پر منفی اثر پڑے گا۔ روٹیشن کے باعث دوتہائی مرد اور خواتین اپنی اپنی سیٹوں پر قابض نہیں رہیں گے اور ایک تہائی کو دوبارہ منتخب ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ اس ریزرویشن کے اہتمام کے بارے میں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ 15 سال کے لیے ہی ہوگا۔ یہ ایک خیال خام ہے۔ 15 سال کے بعد بھی خواتین مساوات کے معاملے میں مردوں کے برابر نہیں آپائیں گی اور یہ مدت، جیسا کہ درج فہرست ذاتوں اور قبائل کی ریزرویشن کی مدت بار بار بڑھانے کے معاملے میں کیا جارہا ہے، بار بار بڑھائی جاتی رہے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ ریزرویشن کا فیصد بڑھا کر 50 فیصدی کرنے کی مانگ بھی سامنے آئے گی۔

(خواتین کی اختیارکاری وصنفی مساوات، خواجہ عبدالمنتقم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی، 2018)

شہانہ خاتون

دوسرا سائبان

جہالت کا ایک نمونہ مجھے اپنے ڈرائیور اشرف کی موت پر دیکھنے کو ملا۔ وہ ہمارے ہاں پچھلے دس سال سے ڈرائیور کی خدمت انجام دے رہا تھا۔ اچانک ہارٹ فیل ہو جانے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ صبح صبح یہ منحوس خبر سن کر ہمارے گھر کا ماحول سوگوار ہو گیا۔ خدا بخشے، مرحوم بڑی اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ بہت محنتی اور ایماندار، نہ کبھی ناغہ کرتا، نہ کبھی دیر سے کام پر آتا، اپنی پرخلوص خدمات سے اس نے ہم سب کا دل جیت لیا تھا۔

عصر میں تدفین کا اعلان سن کر میں اور ساسو ماں ظہر کی نماز کے بعد اس کے گھر پہنچے۔ اشرف کی بیوی زاہدہ سے میں بس ایک دو بار ہی ملی تھی جب وہ عید کی ملاقات کے لیے گھر آئی تھی۔ تیس سالہ سانولے رنگ اور تیکھے نقوش والی زاہدہ کی ہنسی بہت دلکش تھی۔ ہنستی تو اس کے خوبصورت دانت چمکنے لگتے اور اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے۔ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، لیکن بات چیت سے لگتا تھا کہ وہ دسویں پاس تو ضرور ہو گی۔ شادی کو بارہ سال گزر چکے تھے اب وہ آٹھ سالہ بیٹا اور چھ سالہ بیٹی کی ماں تھی۔

شہر کے پسماندہ علاقہ میں ڈھائی سو گز زمین پر بنے کچے مکان میں وہ لوگ رہتے تھے۔ دو کمرے اور دالان والے اس گھر کا صحن کافی بڑا تھا۔ صحن کے ایک طرف گڑھا کھود کر میت کو غسل دینے کا انتظام کیا گیا تھا۔ کچے صحن میں پانی کی نکاسی کا کوئی راستہ نہیں تھا، اس لیے غسل کا سارا پانی گڑھے میں جمع ہو رہا تھا۔ عصر کی نماز سے پہلے پہلے میت تیار ہو گئی تو آخری دیدار کے لیے ساری عورتیں صحن میں جمع ہو گئیں۔ اشرف کی ماں سینہ کوبی کرتے ہوئے بین کر کے رو رہی تھی۔ اشرف کی دو جوان بہنیں غم سے نڈھال تھیں۔ بھائی کو کفن میں دیکھ کر بڑی بے قراری سے رونے لگیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔

زاہدہ کو اپنا ہوش نہیں تھا۔ بے حس و حرکت بیٹھی تھی نہ آنکھ میں آنسو تھے اور نہ لب پر فریاد۔ دو چار عورتوں نے آخر میں اسے گھسیٹ کر میت کے سرہانے لا کھڑا کیا۔ ان میں سے ایک عورت بولی ”دلہن اپنے شوہر کو آخری سفر پر روانہ کرنے سے پہلے اپنا حق مہر معاف کر دو! تاکہ وہ آخرت میں تمہارا قرض دار نہ رہے۔“

زاہدہ کو خاموش پا کر دوسری عورت نے وہی الفاظ دہراتے ہوئے زور دیا کہ وہ اپنی زبان سے اپنا مہر معاف کر دے، زاہدہ نے کچھ عجیب سی نظروں سے انہیں دیکھا جیسے وہ کسی ایسی زبان میں بات کر رہی تھیں جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ایک بوڑھی عورت نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ”زاہدہ! اپنے شوہر کا آخری دیدار کر لو اور اپنا حق مہر معاف کر کے اسے رخصت کرو۔“

زاہدہ یوں چونک پڑی جیسے گہری نیند سے جاگی ہو، چاروں طرف وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگی، اسی عورت نے اس کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا ”بولو زاہدہ بولو!“

زاہدہ نے اس عورت کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا

”زاھدہ کو اپنا ھوش نہیں تھا۔ بے حس و حرکت بیٹی تھی نہ آنکو میں آنسو تھے اور نہ لب پر فریاد دو چار عورتوں نے آخر میں اسے گھسیٹ کر میت کے سرھانے لا کھڑا کیا۔ان میں سے ایک عورت بولی ” دلھن اپنے شوھر کو آخری سفر پر روانہ کرنے سے پھلے اپنا حق مھر معاف کر دو! تاکہ وہ آخرت میں تمھارا قرض دار نہ رھے۔“

”کیا بولوں......؟“

”بولو! میں زاہدہ بیگم زوجہ اشرف علی مرحوم، اپنے شوہر کو اپنا حق مہر ڈھائی ہزار روپے دل و جان سے معاف کرتی ہوں۔“

”ارے واہ! زاہدہ مہر معاف کیوں کرے؟ مرحوم کو ملنے والی رقم میں سب سے پہلے زاہدہ کا مہر ادا ہوگا۔“ زاہدہ کے مائکہ کی ایک عورت نے سختی سے کہا۔

”اے خالہ! تم چپ رہو، جو ہو رہا ہے اسے ہونے دو، تم خواہ مخواہ بات مت بڑھاؤ۔“ زاہدہ کی پھوپھی اسے کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔

مہر معاف کروانے کے بعد جنازے کو رخصت کیا گیا۔ کچھ عورتیں اندر آ گئیں اور کچھ صحن میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ میں دالان میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ یہ کیسی بدنصیبی کی بات ہے کہ مرد جو اپنی آخری سانس تک اپنی بیوی کی ضروریات کا خیال رکھتا ہے، اسے آرام پہنچانے کے لیے زندگی بھر محنت کرتا ہے، تحائف دے کر اسے خوش کرتا ہے، دکھ درد اور بیماری میں اس کا ساتھ دیتا ہے، صرف ڈھائی ہزار روپے مہر کی مد میں ادا نہ کرنے سے اس کا مجرم بن جاتا ہے۔ دنیا سے رخصت ہوتے وقت بھرے مجمع میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اس سے مہر معاف کروایا جاتا ہے۔ اگر کوئی عورت اپنا مہر معاف نہ کرنا چاہے تو کیا وہ ایسے نازک وقت میں انکار کرنے کی جرأت کر سکتی ہے؟

کتنا اچھا ہو اگر ہر مرد بیاہتا زندگی کے آغاز سے پہلے اپنی بیوی کا حق مہر ادا کر دے، جیسا کہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کا فرمان ہے، ورنہ اس فرض کو قرض بنتے دیر نہیں لگتی، کیونکہ عدم تکمیل کی صورت میں ایک نقطہ بڑھ کر وبالِ جان بن جاتا ہے۔

باہر صحن میں بیٹھی دو تین عورتوں نے زاہدہ کو پکڑ کر اس گڑھے کی منڈیر پر بٹھا دیا جو میت کے غسل کا پانی جمع کرنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ گڑھے کے پانی میں ان گنت روئی کے گولے اور سفید کپڑے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے جو غسل کے دوران استعمال کیے گئے تھے۔ ایک عورت نے زاہدہ کی دونوں کلائیوں سے کانچ کی چوڑیاں توڑ کر گڑھے میں ڈال دیں۔ اس کے گلے سے کالی پوت کا لچھا اور کانوں سے بالیاں نوچ کر گڑھے میں پھینک دیں اور سر سے رنگین دوپٹہ کھینچ کر گڑھے کے حوالے کر دیا، میت سے اتاری سفید چادر زاہدہ کو اڑھاتے ہوئے کہا:

”آج سے تم صرف سفید کپڑے پہنو گی، تمہارا سارا سنگھار اور رنگین لباس تمہارے میاں کے ساتھ رخصت ہو گئے، اب ساری زندگی تمھیں اپنے شوہر کی موت کا سوگ منانا ہے۔“

ان عورتوں کے قصائی جیسے سلوک اور سختی سے کی گئی تاکید کو سن کر زاہدہ تڑپ تڑپ کر رونے لگی، جیسے اس نے ابھی ابھی شوہر کی میت دیکھی ہو، ساری عورتیں چپ چاپ اور گم صم زاہدہ کو دیکھ رہی تھیں اور اس کی آہ و بکا سن کر ان کی آنکھیں بھی اشکبار ہو رہی تھیں۔

”ان عورتوں کے قصائی جیسے سلوک اور سختی سے کی گئی تاکید کو سن کر زاھدہ تڑپ تڑپ کر رونے لگی، جیسے اس نے ابھی ابھی شوھر کی میت دیکھی ھو، ساری عورتیں چپ چاپ اور گم صم زاھدہ کو دیکو رھی تھیں اور اس کی آہ و بکا سن کر ان کی آنکھیں بھی اشکبار ھو رھی تھیں“

میت کے اُٹھ جانے کے بعد عورتیں اندر بیٹھیں آنے والے حالات سے نمٹنے کے بارے میں باتیں کر رہی تھیں۔ اشرف کی ماں کے قریب بیٹھی ایک عورت نے زاہدہ کی جانب کن انکھیوں سے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا: ”اب اس منحوس کا کیا کرنا ہے؟“

”کرنا کیا ہے؟ نکال باہر کرو، جوان میاں کو کھا گئی کم بخت، جب بیٹا ہی نہیں رہا تو بہو کا کیا کام؟“ ایک اور عورت نے فیصلہ کن انداز میں کہا، جیسے سارے فیصلے کرنے کا اختیار اسی کو حاصل تھا۔

''باہر سے بلاوا آیا تو میں اور امی گھر آ گئے، مجھے تعجب اس بات پر ہور رہا تھا کہ ابھی اشرف کی میت دفنائی بھی نہیں گئی تھی، عورت نے ایسی باتیں شروع کر دی تھیں۔ زاہدہ کی صورت میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتی نہ تھی۔ ایک تو اس غریب کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا تھا، دوسرا ظلم اس کے سسرال والے اس پر ڈھانے کی سوچ رہے تھے''

''کیا کہہ رہی ہو؟'' ایک معتبر خاتون نے زاہدہ کی ہمدردی کرتے ہوئے کہا، ''کہاں جائے گی بے چاری؟ غریب کی ماں بھی زندہ نہیں۔''

''کہیں بھی جائے ہمیں کیا! ماں مرگئی تو کیا ہوا، باپ اور بھائی تو زندہ ہیں۔'' اسی بے درد عورت نے جواب دیا، ''وہی اس کی اور اس کے بچوں کی پرورش کرلیں گے۔''

''کچھ تو مروت سے کام لو! بے چاری نے بارہ سال تک پورے خاندان کی خدمت کی ہے۔''

''خدمت کے عوض روٹی، کپڑا نہیں لیا گیا؟'' اسی عورت نے ابرو چڑھاتے ہوئے کہا۔

''بہو تو خیر غیر ہے، لیکن بچے تو اسی خاندان کے چراغ ہیں، ان پر رحم کرو۔'' اسی ہمدرد خاتون نے کہا۔

''اے بی بی! تم چپ رہو! اتنا ہی رحم آ رہا ہے تو زاہدہ اور اس کے بچوں کو تم اپنے گھر لے جاؤ۔''

باہر سے بلاوا آیا تو میں اور امی گھر آ گئے، مجھے تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ ابھی اشرف کی میت دفنائی بھی نہیں گئی تھی، عورت نے ایسی باتیں شروع کر دی تھیں۔ زاہدہ کی صورت میری آنکھوں کے سامنے سے ہٹتی نہ تھی۔ ایک تو اس غریب کے ساتھ اتنا بڑا حادثہ ہو گیا تھا، دوسرا ظلم اس کے سسرال والے اس پر ڈھانے کی سوچ رہے تھے۔

مجھے گم صم دیکھ کر میری ساسو ماں نے مجھے دلاسہ دیا کہ کہنے اور کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے، ہوسکتا ہے زاہدہ کی ساس کو اس پر اور اس کے بچوں پر ترس آ جائے اور وہ ان کی کفالت کی ذمہ داری قبول کر لے۔ اس مثبت بات کے سنتے ہی مجھے کچھ اطمینان ہوا اور میں نے خلوص دل سے دعا کی کہ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔

کچھ دن بعد مالی نے بتایا کہ چہلم ہوتے ہی اشرف کی ماں نے زاہدہ اور اس کے دونوں بچوں کو اس کے باپ کے گھر بھجوا دیا، احتجاج کرنے والوں کو جواب دیا۔

''میرا چھوٹا بیٹا اپنی دو کنواری بہنوں کی شادی کرے گا یا اپنی بیوہ بھابی اور اس کے دو بچوں کو پالے گا؟ پھر اسے اپنی شادی کے لیے بھی تو پیسے جمع کرنے ہیں۔''

اس اطلاع کے ملتے ہیں ساسو ماں مجھے لے کر زاہدہ کے باپ کے گھر پہنچیں۔ ان کا خیال تھا کہ زاہدہ کی خیر خیریت معلوم کرلیں گے اور اسے کچھ پیسے دے کر آئیں گے۔ جب ہم اس کے گھر پہنچے تو دیکھا مٹی کے گو بلو کا بنا ایک نہایت خستہ حال گھر تھا، جو ایک کمرے اور دالان پر مشتمل تھا۔ دالان کے ایک کونے میں جھولے سی چارپائی پر پڑا اس کا باپ کھانس رہا تھا۔ دوسرے کونے میں مٹی کے چولہے میں گیلی لکڑیاں سلگ رہی تھیں جن سے نکلنے والے کڑوے کسیلے دھویں سے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ زاہدہ کی بھاوج چولہے کے سامنے بیٹھی کچھ پکا رہی تھی، ہمیں دیکھتے ہی نہ دعا نہ سلام جھٹکے سے اٹھ کر کمرے میں چلی گئی جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ زاہدہ اور اس کے بچوں کے آنے سے سخت ناراض تھی۔ زاہدہ کا رو رو کر برا حال تھا۔ اس کے کپڑے میلے کچیلے تھے اور سر پر اوڑھی چادر جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھا تو بلک بلک کر رونے لگی جیسے اسے ایک مدت بعد کوئی مہربان ہستی نظر آئی ہو۔ وہ ساسو ماں کے گلے لگ گئی میں نے پاس رکھے مٹی کے گھڑے سے پانی کا گلاس بھر کر اسے پلایا۔

جب وہ کچھ پر سکون ہوئی تو امی نے اس سے پوچھا ''بچے کہاں ہیں؟''

اس نے کہا ''اسکول گئے ہیں۔''

میں نے پوچھا ''کیسی گزر رہی ہے؟''

وہ بڑے دکھ سے بولی ''ابا تو کچھ کماتا نہیں، ہماری وجہ سے گھر میں بہت لڑائی ہوتی ہے، مجھے ڈر ہے کہ بھابی کسی دن مجھے اور بچوں کو گھر سے نکال باہر کر دے گی۔''

''تمھارا بھائی کیا کہتا ہے؟'' امی نے پوچھا۔

''بس یہی کہ میں تم تینوں کو نہیں پال سکتا، اپنا کوئی انتظام کرلو۔''

زاہدہ گالوں پر بہتے ہوئے آنسو پونچھ کر بولی: ''آپ ہی بتائیں

میں دونوں بچوں کو لے کر کہاں جاؤں؟ کون ہے جو مجھے سہارا دے گا؟''

کچھ دیر خاموشی رہی، صرف زاہدہ کی ہچکیوں کی آواز ابھر رہی تھی۔

''پریشان مت ہو، اللہ پر بھروسہ رکھو، وہی سب کی مشکل آسان کرنے والا ہے''، میری امی اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولیں،'' کیا ہوا اگر تمھاری ساس اور تمھارے بھائی نے تمھیں آسرا نہیں دیا؟ ہمت سے کام لو تو تم خود اپنے بچوں کا سہارا بن سکتی ہو، گھبراؤ مت، میرے ساتھ میرے گھر چلو، کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔''

زاہدہ نے حیران نظروں سے امی کی طرف دیکھا جس میں کچھ یقین اور کچھ بے یقینی تھی۔ مصیبت میں اتنا حوصلہ دینے والا بھی مل جائے تو بہت بڑی بات تھی۔ وہ شکر گزاری سے میری امی کے قدموں میں بیٹھ گئی، امی نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' کل میں تمھیں لینے آؤں گی، اپنے بھائی کو بتا دینا۔''

دوسرے دن امی اسے لینے گئیں تو ہارن کی آواز سنتے ہی زاہدہ اپنے بچوں کے ساتھ آ کر کار میں بیٹھ گئی اس کی بھابی، بھائی اور باپ نے گھر سے باہر نکل کر خدا حافظ کہنا بھی گوارا نہیں کیا۔

امی نے اسے سرونٹ کواٹر دے دیا، ضرورت کی کچھ چیزیں گھر سے دیں اور کچھ چیزیں نئی دلائیں اور کہا کہ'' جب تک تمھاری عدت کے دن ختم نہیں ہو جاتے تم آرام سے رہو، اس کے بعد سوچتے ہیں کیا کرنا ہوگا۔''

ہمارے گھر آنے کے بعد زاہدہ نے چین کا سانس لیا۔ دونوں بچے اسکول جانے لگے اور میں اور امی آپس میں مشورہ کرتے رہتے کہ اس کے لیے کون سا کام مناسب رہے گا جس کے کرنے سے وہ اتنا کما لے کہ اپنے بچوں کے ساتھ آرام سے زندگی گزار سکے۔

امی روز اس کے پاس جاتیں، اسے حوصلہ دیتیں کہ اگر تم ہمت کرو تو کچھ بھی کر سکتی ہو، اس دنیا میں اس حادثے سے گزرنے والی تم ہی تنہا عورت نہیں ہو، آئے دن عورتیں بیوہ ہوتی ہیں، ہمت اور ایمانداری سے محنت کر کے اپنے بچوں کو پال پوس کر جوان کر کے انھیں عزت کی روٹی کمانے کے قابل بناتی ہیں۔

امی کی حوصلہ افزائی سے زاہدہ میں بھی حالات سے مقابلہ کرنے کی طاقت آ گئی۔ امی نے اسے بتایا کہ میری ایک رشتہ دار خاتون ریڈی میڈ گارمنٹ کی فیکٹری چلاتی ہیں جہاں تم جیسی پریشان حال چالیس پچاس عورتیں سلائی کرنے آتی ہیں، میں ان سے کہہ کر تمھیں وہاں رکھوا دوں گی۔

''لیکن مجھے تو سلائی کرنی نہیں آتی؟'' زاہدہ نے بچوں جیسی معصومیت سے کہا۔

''کوئی بات نہیں! ان عورتوں نے بھی تو کام کرنے سے پہلے کسی نہ کسی سے سلائی کرنا سیکھی ہوگی، میں تمھیں سلائی کرنا سکھا دوں گی۔'' امی نے کمال شفقت سے اس کی ہمت بندھائی۔

''زاھدہ نے حیران نظروں سے امی کی طرف دیکھا جس میں کچھ یقین اور کچھ بے یقینی تھی۔ مصیبت میں اتنا حوصلہ دینے والا بھی مل جائے تو بہت بڑی بات تھی۔ وہ شکر گزاری سے میری امی کے قدموں میں بیٹھ گئی، امی نے اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا'' کل میں تمھیں لینے آؤں گی، اپنے بھائی کو بتا دینا۔''
دوسرے دن امی اسے لینے گئیں تو ہارن کی آواز سنتے ہی زاہدہ اپنے بچو''

امی نے اپنی سلائی مشین پر زاہدہ کو سلائی سکھانا شروع کر دیا۔ عدت کے دن ختم ہونے کے بعد زاہدہ سلائی کرنے فیکٹری جانے لگی۔ شروع شروع میں اسے آسان کام دیا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ اس نے تمام کام سیکھ لیا اور اپنی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پیسے کمانے لگی۔

امی نے زاہدہ کو سمجھایا کہ تم ہر ماہ اپنی ساس اور بھابی کی تھوڑی بہت مدد کر دیا کرو تا کہ ان کی دعائیں ڈھال بنیں تمھارے بچوں کو زمانے کے سرد و گرم سے بچاتی رہیں۔ زاہدہ امی کی ہر بات پورے خلوص اور عقیدت سے مان لیا کرتی تھی۔ اس کے حسن سلوک نے رشتوں کے درمیان فاصلے مٹا دیے اور یوں اس کے بچوں کو اپنے بڑوں کا پیار اور دعائیں بھی ملنے لگیں۔

امی کی نصیحتوں اور ہدایت پر عمل کر کے زاہدہ نے ثابت کر دیا کہ جن عورتوں کے سروں پر سے سائبان چھن جاتا ہے وہ ہمت اور استقلال کے ذریعہ اپنے بن باپ کے بچوں کے سروں پر سائبان کی طرح خود کو تان لیتی ہیں۔

□□□

Shahana Khatoon
8-1-21/9, Surya Nagar
Tolichowki
Hyderabad-500008 (Telangana State)

شاہدہ شاہین

نورزارا

کھٹ کھٹ کھٹ........بیساکھی کی گونج دار آواز سنائی دیتے ہی اچانک محفل پر ایک سوگوار سا سناٹا چھا گیا۔ سب نے اپنی نگاہیں صدر دروازے پر مرکوز کر دیں۔ ایک سرخ وسپید رنگت اور متناسب وخوش گوار نین نقش والا نوجوان، جس کی پیٹھ پر ایک بڑا سا کوبڑ تھا، پستہ قد، دائیں طرف بغل میں بیساکھی دبائے، بایاں پیر سوکھا اور سکڑا ہوا زمین سے ذرا اوپر لٹکتا ہوا، گلے میں پھولوں کا ہار پہنے ہوئے اندر داخل ہوا۔ وہ اپنا دایاں پیر زمین پر رکھتا اور پھر بغل میں دبی بیساکھی پر اپنے جسم کا پورا وزن ڈالتے ہوئے ذرا سا اچھل کر آگے بڑھتا۔ محفل میں موجود افراد سانس روکے ہوئے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

حاضرینِ محفل کی نگاہوں میں جذبۂ ترحم موجزن تھا پر نوجوان کے چہرے اور حرکات وسکنات سے خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ بالآخر شہ نشیں کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے ساتھی کے بازوؤں کا سہارا لیتے ہوئے بغل سے بیساکھی نکال کر کنارے رکھ دی اور مسند پر بیٹھ گیا جہاں قاضی صاحب اس کے انتظار میں نکاح کا دفتر کھولے بیٹھے ہوئے تھے۔

دم بخودسی میں ہال سے متصل کمرے کے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے ساری کارروائی دیکھنے میں منہمک تھی.......یہ نورزارا کا دولہا تھا جو اسے بیاہ کر لے جانے آیا تھا۔ میرے پیچھے صوفوں پر براجمان مہمان عورتیں نہ جانے کیا کیا خیال آرائیاں کیے جا رہی تھیں۔ ان کی باتیں سن کر میرا دم گھٹا جا رہا تھا......پھر نہ جانے کیا ہوا کہ میرا گلا بھر آیا اور دھاڑیں مار کر رونے کو جی چاہنے لگا۔ میں بے تحاشہ پلٹ کر وہاں سے بھاگ نکلی کہ کہیں سچ مچ میری چیخیں نہ نکل جائیں! اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر گئی اور تکیے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نورزارا کو بچپن سے دیکھتی آئی ہوں.....گاڑھی سانولی رنگت، تنگ پیشانی، موٹی موٹی بھنویں، ستاروں کی طرح چمکتی ہوئی چھوٹی بٹن جیسی آنکھیں، چپٹی ناک، چوڑا دہانہ، درمیانہ قد اور دراز چوٹی والی نورزارا سے میں بے حد مانوس ہوں اور اسی کی نگرانی میں پل کر بڑی ہوئی ہوں۔

امّی کی زبانی سنا تھا کہ تقریباً اٹھارہ بیس سال پہلے ایک دن بعد نمازِ فجر ہمارے دادا جان کو ایک چار سالہ بچی مسجد کی سیڑھیوں پر اکیلی بیٹھی ہوئی ملی جو لوگوں کے تجسس کے جواب میں چپ چاپ خالی آنکھوں سے سب کے چہرے تکے جا رہی تھی۔ اس دبلی پتلی معصوم سی لڑکی پر دادا جان کو رحم آگیا۔ اسے پیٹ بھر کھانا کھلانے اور بہ حفاظت اس کے لواحقین تک پہنچانے کی ذمہ داری اپنے سر لیتے ہوئے اپنے ساتھ گھر لے آئے۔

اس نے بڑی بے صبری کے ساتھ ناشتہ کیا تھا اور پھر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہیں لڑھک کر گہری نیند سو گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کافی دیر سے بھوکی تھی اور گذشتہ رات سوئی بھی نہیں تھی۔ دوپہر کے قریب جاگی۔ ہر سوال کے جواب میں اس کے چہرے پر ایک عجیب سی خاموشی چھا جاتی اور آنکھوں میں اُلجھن کے سائے تیرنے لگتے۔ ایسا لگتا تھا جیسے اپنے بارے میں سب کچھ بھول چکی ہے۔ اسے صرف اپنا نام یاد تھا بس۔

دادا جان نے سب کو مزید استفسار کرنے سے منع کرتے ہوئے کہا تھا۔ ”بے چاری، نہ جانے کس نوعیت کی دکھ بھری کیفیت سے ہو کر

”اس نے بڑی بے صبری کے ساتھ ناشتہ کیاتھااور پھر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد وہیں لڑھک کر گھری نیند سو گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کافی دیر سے بھوکی تھی اور گذشتہ رات سوئی بھی نہیں تھی۔ دو پھر کے قریب جاگی۔ ہر سوال کے جواب میں اس کے چھرے پر ایک عجیب سی خموشی چھا جاتی اور آنکھوں میں اُلجھن کے سائے تیرنے لگتے ۔ایسا لگتا تھا جیسے اپنے بارے میں سب کچھ بھول چکی ہے ۔اسے صرف اپنا نام یاد تھابس“

گزری ہے جس کی یادیں اپنے ذہن سے مٹا ڈالنا چاہتی ہے۔ خیر..... جلدی کیا ہے جب مرضی ہوگی اپنے بارے میں بتادے گی۔“ پھر وہ بچوں کے ساتھ گھل مل کر کھیلنے لگی لیکن ایک عرصہ گذر جانے کے بعد بھی اس کے منہ سے کچھ نہ نکلا۔

ایک دن اس کا بڑا بھائی اسے ڈھونڈتا ہوا آ گیا۔ مسجد میں کسی نے اسے خبر دی تھی۔ نورزارا نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ تب کہیں جا کر ان کی اصلی کہانی پتہ چلی ......وہ دونوں بن ماں کے بچے تھے۔ باپ نے دوسری شادی کرلی۔ سوتیلی ماں نے بے چارے بچوں پر ظلم کا پہاڑ توڑ دیا۔ لڑکا کہیں باہر کام پر چلا جاتا تھا اور سارا دن گھر سے غائب رہتا۔ شام کو مزدوری کے پیسے لاکر سوتیلی ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ معصوم سی چار سالہ بچی جو گھر پر رہتی تھی صبح شام اس عورت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی۔ اسے تو چھوٹے موٹے کام بھی کرنے نہیں آتے تھے۔ لہٰذا مسلسل سوتیلی ماں کے عتاب کا نشانہ بنتی رہتی تھی۔ وہ اسے عجیب عجیب اذیتیں دیا کرتی تھی جس کی تفصیل بتاتے ہوئے وہ رو پڑا تھا اور سننے والوں کی آنکھیں بھی نم ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں۔

اور پھر ایک دن نہ جانے کس رو میں بہہ کر بچی گھر سے نکل کھڑی ہوئی ۔اسے ڈھونڈنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی گئی...... یہاں اسے مطمئن اور ہشاش بشاش پا کر وہ بہت خوش ہوا تھا اور ہاتھ جوڑ کر منت کرنے لگا کہ نورزارا کو یہیں رہنے دیا جائے۔ وہ بھی اپنے لوگوں پر ظاہر نہیں کرے گا اور چوری چھپے کبھی کبھار اس سے ملنے آتا رہے گا۔ گھر کے افراد ان دونوں کی درد بھری کہانی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ ایک غریب بے سہارا کے یہاں پڑے رہنے پر بھلا کسے اعتراض ہوسکتا تھا۔

امّی بتا رہی تھیں کہ میں انہی دنوں میں پیدا ہوئی اور نورزارا کو جیسے میری صورت میں ایک گڑیا مل گئی۔ وہ مجھے ایک پل کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ سارا دن اپنی کمر پر اٹھائے گھومتی تھی۔ اس کے ہاتھوں چاندی کے چمچ سے کھانا کھاتے ہوئے چندا ماما، سفید براق گھوڑا، سبز پری، لُولا راجا اور بھی نہ جانے کتنی کہانیاں سنی تھیں جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔

پلے ہوم میں میرا پہلا دن اور وہ سارا وقت دروازے کے باہر دھوپ میں بیٹھی ہوئی کہ کہیں میں رونے نہ لگوں۔ کئی دنوں تک یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ہر دن صبح مجھے پلے ہوم لے جانا اور دوپہر سے پہلے واپس لانا اس کا معمول بن گیا تھا۔ میں بے بی کلاس سے اسکول پہنچ گئی اور پھر کالج کی سیڑھیاں بھی طے کرلیں۔ نورزارا وہیں کی وہیں رہی۔

سب کوشش کرکے ہار گئے، وہ الف با تو سیکھ گئی مگر انگریزی یا کنٹرکا ایک حرف بھی نہیں سیکھ پائی۔ پہلے منجھلی پھوپھی پھر دادی اماں اور پھر چھوٹی پھوپھی اپنی سی کرکے ہار گئے۔ بالآخر میں بھی اس کی ٹیچر بن گئی لیکن وہ اتنی کند ذہن ثابت ہوئی کہ ہر کوشش لاحاصل ثابت ہوئی۔

جب گھر کے سارے افراد کی پرخلوص سعی پیہم کے باوجود اس کے پلے کچھ نہ پڑا تو بھلا اسکول جا کر کون سا تیر مار لیتی۔ ویسے بھی سوتیلی ماں کے ڈر سے اسے اسکول تو کجا گھر سے باہر بھی نہ بھیجنے کی تاکید کی گئی تھی۔ دادی اماں کی ایما پر منجھلی پھوپی نے انتہائی ضبط وتحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے قرآنی آیات سے بہرہ ور کروا کے ہی دم لیا۔ بہر حال قرآنی پاروں کے علاوہ وہ اور کوئی کتاب پڑھنا نہیں سیکھ پائی۔ کچھ عرصہ بعد دادی ماں نے کشیدہ کاری، بنائی کڑھائی سکھانے کا بیڑا اٹھایا۔ بالآخر صرف بُنائی پر اکتفا کرنا پڑا۔ وہ کروشیا کے ذریعے اچھے ڈیزائن بنالیتی تھی۔ اسے بس یہی آتا تھا۔

منجھلی پھوپی بیاہ کر اپنی سسرال چلی گئیں۔ چھوٹی پھوپی کا بھی ایک اونچے گھرانے میں رشتہ طے ہوگیا۔ گریجویشن ختم ہونے سے پہلے ہی میرے لیے کئی رشتے آ چکے تھے۔ حیدر کاظمی جو بیرون ملک انجینیر کے عہدے پر فائز تھے سب ان کے بارے میں سنجیدہ ہو رہے تھے، اگر بات نہیں بن پا رہی تھی تو نورزارا کی۔ گھر کی اور لڑکیوں کی طرح وہ بھی دادی جان کو بے حد عزیز تھی۔ وہ اپنے جیتے جی اس کا گھر بستا ہوا دیکھنے کی متمنی تھیں۔ مشاطہ اس کے لیے جس نوعیت کے رشتے لا رہی تھی اس سے میری

دادی جان از حد ناخوش تھیں۔ طرح طرح کے رشتے.....کوئی بیڑی مزدور یا تانگہ گاڑی ہانکنے والا تو کوئی لاری میکینک۔ اپنی نورزارا کے لیے ناخواندہ اور نچلے طبقے کے لڑکوں کے رشتے دادی جان کی حساس طبیعت پر بہت گراں گزرتے تھے۔

''بے چاری ایک جاہل انسان کے ساتھ بھلا کیسے نباہ کرے گی۔ ہمارے ماحول میں پلی بڑھی، آیا ایک حد سے زیادہ پچھڑے خاندان میں جی پائے گی ہماری نورزارا؟ اس کا دم نہیں گھٹ جائے گا!'' اس طرح فکر کرتے دادی جان نے اپنی راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر لیا تھا۔ اکثر رات کے اندھیرے میں انھیں تنہا پائیں باغ میں بے چینی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے دیکھا گیا تو سب کو فکر لاحق ہوگئی کہ کہیں دادی جان کی صحت نہ متاثر ہو جائے۔ اب کی بار جب بڑی پھوپی میکے آئیں تو امی نے من وعن سارا احوال کہہ سنایا۔ پھوپھی جان گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ اسی شام مشاطہ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے جتا دیا کہ نورزارا کو منہ مانگا جہیز، زیور، کپڑے لتے سب کچھ فراہم کیا جائے گا بس لڑکا ذرا معقول ہو۔

مشاطہ نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے جواب دیا تھا۔ ''بی بی۔ میری کسی سے دشمنی تھوڑی ہے جو جان بوجھ کر ایسے رشتے لاؤں گی۔ پوچھ لیجیے بی اماں سے، ان کے کہنے کے مطابق میں نے بھی نہ جانے کتنوں کو لالچ دیا لیکن کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا! ہاں ......ایک رشتہ ہے نظر میں لیکن مجھے خدشہ ہے کہ آپ لوگ شاید ہی اسے منظور کریں گے۔''

''لو بھلا، اگر سب کچھ ہمارے اندازے کے مطابق ہوا تو کیوں نہیں منظور کریں گے!'' منجھلی پھوپی نے فوراً کہا۔

''لڑکا تعلیم یافتہ ہے۔ سرکاری اسکول میں معلم کے عہدے پر فائز ہے لیکن......ایک ذرا سا نقص ہے'' مشاطہ نے جھجکتے ہوئے بتایا۔

''ایسا کون سا نقص ہے۔ کھل کر بتاؤ تو سہی......'' پھوپی نے اتاولی ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سنا ہے کہ لڑکے کو بچپن میں پولیو ہو گیا تھا جس کی وجہ سے بے چارے کے دائیں پیر میں تھوڑی کمزوری آگئی ہے۔'' مشاطہ نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

دادی ماں اور منجھلی پھوپی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور فکرمندانہ انداز میں نظریں جھکا لیں۔ تیر نشانے پر لگتے دیکھ مشاطہ نے فوراً اپنے جھولے سے لڑکے کی تصویر نکال کر سامنے رکھ دی۔ اسے سرسری نظر سے دیکھنے کے بعد مشاطہ کو اگلے دن جواب دینے کا وعدہ کر کے رخصت کر دیا گیا۔ پھر منجھلی پھوپھی یوں گویا ہوئیں:

دادی ماں اور منجھلی پھوپی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھااور فکر مندانہ انداز میں نظریں جھکا لیں۔تیر نشانے پر لگتے دیکھ مشاطہ نے فوراً اپنے جھولے سے لڑکے کی تصویر نکال کر سامنے رکھ دی۔اسے سرسری نظر سے دیکھنے کے بعدمشاطہ کو اگلے دن جواب دینے کا وعدہ کر کے رخصت کر دیا گیا۔پھر منجھلی پھوپھی یوں گویا ہوئیں :

''اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ گزرتے وقت کے ساتھ جوان لڑکی کا بوجھ گیلے کمبل کی طرح وزنی ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر سرے سے رشتہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے ...... میری رائے میں اس لڑکے کو گھر بلا کر دیکھ لیتے ہیں۔ صورت شکل تو اچھی خاصی ہے، ہو سکتا ہے معمولی سا نقص ہو۔ویسے بھی اپنی لڑکی میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ایسے معاملوں میں تھوڑا بہت سمجھوتا تو کرنا پڑتا ہے۔''

''اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ گزرتے وقت کے ساتھ جوان لڑکی کا بوجھ گیلے کمبل کی طرح وزنی ہوتا چلا جاتا ہے اور پھر سرے سے رشتہ ملنا دشوار ہو جاتا ہے......میری رائے میں اس لڑکے کو گھر بلا کر دیکھ لیتے ہیں۔ صورت شکل تو اچھی خاصی ہے، ہو سکتا ہے معمولی سا نقص ہو۔ ویسے بھی اپنی لڑکی میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایسے معاملوں میں تھوڑا بہت سمجھوتا تو کرنا پڑتا ہے۔''

دوسرے دن مشاطہ لڑکے کو اس کے چند دوستوں کے ہمراہ لے کر آگئی۔ ایک ماں کے علاوہ اس کا دنیا میں اور کوئی رشتہ دار نہیں تھا۔ لڑکے کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ گورا چٹا خوبصورت چہرے کا مالک، بات چیت اور رکھ رکھاؤ میں بے حد مہذب اور اتنا سادہ لوح کہ اگر اس ایک نقص کو نظر انداز کر دیا جائے تو نورزارا کے نصیب پر عش عش کیا جا سکتا تھا۔

سب کے سب عجیب کشمکش میں پڑ گئے تھے۔ دادی جان کے تو آنسو بہہ نکلے۔ اندرونی کمرے میں مجلس بیٹھی۔ منجھلی پھوپی نے اعلان کیا کہ یہ کسی کی ذاتی زندگی کا سوال ہے۔ اس معاملے کا تصفیہ اس طرح ہوگا کہ نورزارا بذاتِ خود اپنی آنکھوں سے لڑکے کو دیکھے گی اور پھر جو فیصلہ لے گی وہی حرفِ آخر ہوگا اور ہمیں اس کے جذبات کی قدر کرنی ہوگی۔

بظاہر وہ انجان بنی ہوئی تھی پر بخوبی جانتی تھی کہ ان دنوں اس کے مستقبل کے تعلق سے گھر کے تمام افراد کس قدر فکر مند ہیں۔ لاکھ اپنائیت سہی لیکن تھی تو غیر ہی۔ علاوہ ازیں اس تلخ حقیقت کا بھی احساس تھا کہ جس لڑکے کا رشتہ اس کے لیے آیا ہے عام حالات میں وہ ہرگز اس کا طلب گار نہ ہوتا۔

اس گھر میں بے فکری کے ساتھ اس کا بچپن بیتا جوانی آئی۔ کبھی ایک پل کے لیے بھی محسوس نہیں ہوا کہ وہ یہاں غیر ہے یا اس کی حیثیت گئی گزری ہے۔ بی اماں اس کے لیے حقیقی ماں سے بڑھ کر تھیں۔ اوروں نے بھی کبھی اس کے ساتھ بیگانگی نہیں جتائی تھی۔ ممتا، پیار دلار، اپنا پن سب کچھ جی بھر کر ملا تھا۔ گھر کے تمام افراد آنکھ موند کر اس پر بھروسہ کرتے تھے۔ گھر کا آدھے سے زیادہ نظام اسی کے ہاتھوں میں تھا۔

بہر حال دنیاداری کے رسم ورواج کے مطابق بڑی پھوپھی اور منجھلی پھوپھی کی طرح اسے بھی جلد از جلد اس گھر سے وداع ہونا تھا۔ یہ بھی یقین تھا کہ محض بوجھ اتار پھینکنے کے ارادے سے یا دیدہ دانستہ اسے کسی ادنیٰ و گھٹیا انسان کے پلے بھی نہیں باندھا جائے گا۔

مہمانوں کا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ کچھ دیر بعد ابا مہمانوں کو کمرۂ طعام میں لے گئے۔ دریں اثنا منجھلی پھوپی نورزارا کے پاس چلی گئیں۔ لڑکے اور اس کے خاندان کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتے ہوئے بالخصوص ان رشتوں کا بھی ذکر کیا جو اس کے لیے انتہائی ناقص اور غیر مناسب تھے۔

وہ سر جھکا کر چپ چاپ منجھلی پھوپی کی باتیں سنتی رہی پھر وہ اسے کمرا طعام سے منسلک کمرے میں لے آئیں۔ کمرا پوری طرح اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا حتیٰ کہ باہر والوں کو اس کے اندر موجود کسی فرد کا نظر آنا ناممکن تھا۔ محفلِ طعام اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ مہمان ایک ایک کر کے واش بیسن میں اپنے ہاتھ دھونے کے بعد باہر والے دالان کا رخ کر رہے تھے۔ وہ بھی اپنے دوست کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دوست نے جلدی سے بیساکھی پکڑا دی جس کے سہارے وہ آگے بڑھا کونے میں لگے ہوئے واش بیسن میں اپنا ہاتھ دھویا اور نیپکن لے کر پونچھتا ہوا باہر نکل گیا۔ دریں اثنا پھوپھی کے اصرار پر نورزارا نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر دو پل اسے دیکھا اور واپس اپنے کمرے میں بھاگ گئی۔ منجھلی پھوپھی بھی تھکے تھکے قدموں سے اس کے پیچھے چل دیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھی تھی اور اس کا بدن ہولے ہولے ہل رہا تھا، غالباً اندر ہی اندر رو رہی تھی۔ پھوپھی کو اس پر ترس آ گیا۔ ازراہِ ہمدردی آگے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

اچانک ان کو حیرت زدہ رہ جانا پڑا۔ توقع کے برخلاف اس کا چہرہ مارے شرم وشادمانی کے گلنار بنا ہوا تھا۔ پھوپھی نے اوپر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شکر اللہ کہا اور بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

نورزارا کی رخصتی کے ٹھیک ایک ہفتہ بعد میں حیدر کاظمی کی شریکِ حیات بن کر امریکہ آ گئی اور زندگی کی نیرنگیوں میں اس قدر کھو گئی کہ ماضی کو یکسر بھلا بیٹھی۔ کبھی کبھی فون پر حال احوال پوچھ لیا کرتی تھی۔ نورزارا کو یاد کر کے اکثر آنکھیں بھیگ جاتیں۔

خاصے لمبے عرصے بعد جب وطن آنا ہوا تو سب سے پہلے اس کی یاد آ گئی۔ پہلی فرصت میں اس سے ملنے کے لیے نکل کھڑی ہوئی۔ شادی کے بعد وہ جس قصبہ میں رہ رہی تھی وہ اب شہری حدود میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کے دونوں بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد نوکری کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر میں قیام پذیر تھے۔

جدید طرز پر بنے ہوئے اس مکان کے لمبے چوڑے دالان میں بلا ناغہ ہر دن تعلیمِ بالغاں کی جماعتیں منعقد ہوا کرتی تھیں جس کی روحِ رواں کوئی اور نہیں اپنی نورزارا تھی۔ اسے اس مقام پر دیکھ کر دل کو بے پناہ شادمانی اور ذہن کو اطمینان حاصل ہوا۔

اس کا جسم قدرے فربہ ہو چلا تھا۔ چہرے پر وہی وقار اور اعتماد جھلک رہا تھا جو میں نے اس دن اس کے شوہر کے چہرے پر دیکھا تھا...... خواندگی و آسودہ پن کا احساس جس نے اس کے سراپا پر ایک سکون پرور چمک لا دی تھی۔ اس کا شوہر اب نہیں رہا تھا لیکن معلم ہونے کے ناطے ایک کوڑھ مغز ہستی کو علم کی روشنی عطا کر گیا تھا جس کی مدد سے وہ لاتعداد نا امید و فضول سی زندگیوں میں خواندگی کی شمع روشن کر کے انھیں جہالت کے اندھیرے سے نکال کر اجالے میں لانے کی اہل ہو چکی تھی۔

□□□

Shahida Shaheen
371, 6th Cross,Opp. Nehru park
Udayagiri- Mysore-570019 (Karnataka)

رومانہ عفت راہی

تم ہی سے ہیں سانسیں

حسین شام ڈھلنے لگی تھی۔ سورج کی زرد کرنیں بھی ماند پڑنے لگی تھی۔ سیاہ ہوتے آسمان کی وسعتوں میں پرندے اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے، کچھ گرم اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکوں سے درخت کے پتے خوب لہلہا رہے تھے۔ وہ بہت خوشگوار موڈ میں 'علی منزل' کے وسیع ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی، لیکن سامنے صوفے پر بیٹھے ہوئے اپنے دشمن کو دیکھ کر اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔ وہ اسے نظر انداز کرتی فائزہ علی کے پاس چلی آئی جو کسی ڈائجسٹ کے مطالعے میں مصروف تھی۔

'السلام علیکم آنٹی!...... لیجیے۔ میں آپ کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنی بریانی لے کر آئی ہوں۔' وہ باؤل ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔

'وعلیکم السلام۔ ہماری عدیرہ اتنی بڑی ہو گئی ہے کہ اب کھانا بھی بنانے لگی ہے۔'' فائزہ علی نے محبت سے اسے دیکھا۔

''آنٹی! ممی مجھے کھانا بنانا سکھا رہی ہیں...... ممی کا بس چلے نا تو وہ مجھے ایک دن میں بیسٹ شیف بنا دے۔ آپ جب میرے ہاتھ کی بنی ہوئی بریانی ٹیسٹ کریں گی تب ہی پتہ چلے گا کہ میں کھانا بنانے میں کتنی ماہر ہو گئی ہوں''۔ عدیرہ فائزہ علی سے لاڈ سے بولی۔

''مام! ان موصوفہ کے ہاتھ کی بنی بریانی کھانے سے بہتر ہے کہ انسان زہر کھا لے۔'' عدین احتشام علی نے عدیرہ غازی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'ہیلو مسٹر! بریانی کھانے کے لیے میں نے آپ کو مدعو ہی کب کیا ہے۔ میں یہ اپنی پیاری آنٹی کے لیے لائی ہوں، عدیرہ غازی ہر ایرے غیرے کو کیوں اپنے ہاتھوں سے بنی بریانی کھلائے گی۔' عدیرہ نے غصہ سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

'تو مر کون رہا ہے آپ کے ہاتھ کی بدمزہ بریانی کھانے کے لیے۔' عدین نے برا سا منہ بنا کر کہا۔ ہمیشہ کی طرح دونوں کی لڑائی شروع ہو چکی تھی۔

''او مائی گاڈ! آپ کی جلد ختم نہ ہونے والی لڑائی کا آغاز ہو چکا ہے'۔ فائزہ علی نے دونوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

'آنٹی! اس ہٹلر نے پہلے لڑائی شروع کی ہے۔' عدیرہ نے کھا جانے والی نظروں سے عدین کو گھورا۔

''تم تو جیسے بالکل گونگی ہی ہو، تمھیں تو کچھ بولنا ہی نہیں آتا۔'' وہ عدین احتشام علی تھا بھلا وہ عدیرہ غازی کا کوئی وار کیسے خالی جانے دیتا۔

''عدین بیٹا! آپ کو کتنی بار کہا ہے کہ ہماری عدیرہ سے اس طرح لڑائی مت کرو...... بچپن کی عادت کو بدلو اب بڑے ہو گئے ہو آپ۔' فائزہ علی نے عدین کو ڈانٹا۔

'کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے مام، کہ آپ میری نہیں اس لڑاکو بلی کی ماں ہیں جو ہمیشہ اس کی ہی سائڈ لیتی ہیں۔' عدین نے خونخوار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

'ایسا نہیں ہے بیٹا آپ دونوں ہی مجھے بے حد عزیز ہو۔' فائزہ علی نے پیار سے اسے سمجھایا۔

'آنٹی رہنے دیجیے کسی کو اپنی صفائی دینے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ لوگ مجھ سے بچپن سے ہی جلتے ہیں۔' عدیرہ نے گردن اکڑا کر کہا۔ 'کیوں تم

کیا کسی ریاست کی ملکہ ہو جو میں تم سے جلوں گا۔ عدین نے کشن اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ عدیرہ نے بھی صوفے پہ رکھے کشن اس پر برسا دیے۔

''عدیرہ آؤ بیٹا آپ میرے ساتھ کچن میں...... ہم ساتھ بیٹھ کر اچھی سی کافی پیتے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ ان کا ڈرائنگ روم جنگ کا میدان بن جائے...... فائزہ علی عدیرہ کو ساتھ لیے کچن میں چلی آئیں۔

غفران غازی اور احتشام علی دونوں بچپن کے دوست تھے۔ دونوں ایک کالونی میں رہتے تھے۔ ''غازی منزل'' کے سامنے ہی ''علی منزل'' تھی۔ دونوں فیملی ممبرز ایک دوسرے سے بہت قریب تھے۔ لیکن عدین احتشام علی اور عدیرہ غازی کی ایک دوسرے سے بنتی ہی نہیں تھی۔ عدین اور عدیرہ دونوں ہی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ عدین عدیرہ سے ایک سال بڑا تھا اور اتفاق کی بات تھی کہ دونوں کی سالگرہ ایک ہی دن آتی تھی۔ بچپن سے ہی ان کے والدین دونوں کی سالگرہ ایک ساتھ ہی مناتے تھے۔ وہ اپنی سالگرہ کے دن بھی ایک دوسرے سے لڑنا نہیں چھوڑتے تھے۔ ان کے بچپن کا کوئی لمحہ اور کوئی وقت ایسا نہیں تھا جو انھوں نے ایک دوسرے سے لڑے بغیر گزارا ہو۔ بچپن کی عادت اب بھی باقی تھی۔ اب بھی انھیں ایک دوسرے سے لڑے بغیر چین ہی نہیں آتا تھا۔ عدین کبھی 'علی منزل' میں نظر آتی تو کبھی عدین غازی منزل' میں نظر آتا۔ نرسری سے وہ ایک ہی کلاس میں تھے۔ اسکول میں بھی وہ سارا سارا دن لڑائی کرتے تھے۔ ان کے والدین انھیں سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے لیکن وہ کسی کی بھی مانتے نہیں تھے۔ ہر روز وہ دونوں نیا جھگڑا کرتے تھے۔ کبھی عدین اس کے بکس چھپا دیتا تو کبھی عدیرہ اس کی سائیکل کا ٹائر پنکچر کر دیتی...... ایک مرتبہ تو عدیرہ نے عدین کے رنگ برنگے پرندوں کو پنجرہ کھول کر اڑا دیا...... عدین نے بھی بدلے میں عدیرہ کی پیاری کیٹ کو کالونی سے دور چھوڑ وا دیا...... وہ جہاں بھی پائے جاتے وہ جنگ کا میدان نظر آتا...... ایک مرتبہ جب عدیرہ نویں کلاس میں تھی...... عدیرہ نے 'علی منزل' کے لان میں لگے امرود کے درخت سے ڈھیر سارے امرود توڑے اور امرود کی باسکٹ لے کر جھولے میں بیٹھ گئی اور مزے سے امرود کھاتے ہوئے زور زور سے ہنسنے لگی...... عدین نے جب اسے اپنی خوشی میں مگن دیکھا تو اس سے رہا نہیں گیا اور چپکے سے اس کے پیچھے سے آکر اسے زور زور سے جھلانے لگا، عدیرہ چلاتی رہی لیکن عدین پہ تو غصہ سوار تھا۔ اس نے عدیرہ کو اتنی زور سے جھولا دیا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پائی اور منہ کے بل زمین پر گر پڑی...... پاس پڑا ہوا پتھر اس کی پیشانی پر لگا تھا، جس کی وجہ سے اس کی پیشانی سے خون بے تحاشہ بہہ رہا تھا۔ احتشام علی نے جب اسے دیکھا تو وہ دوڑتے ہوئے ان کے پاس چلے آئے تھے جبکہ عدین وہاں سے روپوش ہو گیا تھا۔ عدیرہ کو بہت گہری چوٹ لگی تھی، کئی دن تک اس کا علاج چلا تھا۔ احتشام علی نے عدین کو خوب ڈانٹا تھا لیکن وہ عدیرہ کی پیشانی پر لگی ہوئی چوٹ کو ڈھٹائی سے دیکھتا تھا...... اس واقعے کے بعد سے عدیرہ کے دل میں عدین کے لیے اور بھی نفرت بڑھ گئی تھی۔ وہ اسے اپنا دشمن سمجھنے لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بڑے ہو چکے تھے۔ وہ دونوں کمپیوٹر انجینئر بن چکے تھے اور ایک ہی آفس میں جاب کر رہے تھے۔ اتنا وقت گزرنے کے بعد بھی ان کی لڑائی میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا...... وقت ان کی شرارتوں اور لڑائیوں پر مسکراتا ہوا آگے بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

ہر روز کی طرح ایک اور خوبصورت صبح کا آغاز ہو چکا تھا۔ 'علی منزل' کا ہرا بھرا لان سورج کی کرنوں میں نہا رہا تھا۔ پرندوں کی دل آویز بولیوں سے فضائیں گنگنا رہی تھیں۔ پھولوں کی خوشبو ماحول میں بسی ہوئی تھی، ٹھنڈی اور سبک رو ہواؤں کے جھونکوں سے روح کو تراوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ عدیرہ کیاریوں میں لگے پودوں کو پانی دے رہی تھی...... تبھی عدین وہاں چلا آیا تھا۔

''ہیلو کیٹ گڈ مارننگ'' ...... عدین اس کی پشت پر لہراتی سیاہ موٹی سی چوٹی کو کھینچتے ہوئے بولا تو عدیرہ تلملا کر پلٹی۔

''میں اپنے دشمنوں کا گڈ مارننگ نہیں لیتی ہوں''۔ عدیرہ اسے گھور کر بولی...... رنگ برنگے طرح طرح کے پھولوں پہ ننھی منی اوس بے حد حسین لگ رہی تھی۔ عدین پودوں پر لگے خوبصورت سے سرخ گلابوں کو اپنی انگلیوں سے چھونے لگا۔

''ڈونٹ ٹچ مائے فلاور مسٹر عدین۔'' عدیرہ نے پانی کا پائپ عدین کی سمت کر دیا۔ پائپ سے نکلتی پانی کی موٹی سی دھار سے عدین شرابور ہو چکا تھا۔ براؤن ٹراوزر اور براؤن ٹی شرٹ میں ملبوس اس ہینڈسم سے شخص کو عدیرہ نے گیلا کر دیا تھا...... اس سے پہلے کہ عدین بھی جوابی کارروائی کرتا عدیرہ نے جلدی سے پائپ کیاریوں میں پھینک دیا اور اس سے بہت دور جا کھڑی ہوئی تھی اور اپنے دشمن کو دیکھ کر بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ ''زیادہ ہنسو مت اسٹوپڈ گرل۔ میں ابھی کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں پھر اپنا بدلہ لوں گا۔'' عدین اپنے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا اور کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور وہاں سے آگے بڑھ گیا جبکہ عدیرہ کی ہنسی کی بازگشت اسے دور تک سنائی دی۔

رات کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر سمت رات کی سیاہی بکھر چکی تھی۔ سیاہ

آسمان پر ستاروں کے ساتھ چاند جگمگا رہا تھا۔ ہوائیں رقص کر رہی تھیں۔ عدین احتشام علی پورے ایک ماہ کے بعد آج صبح ہی 'علی منزل' واپس لوٹا تھا۔ وہ پچھلے ایک ماہ سے آفس کی طرف سے دہلی گیا ہوا تھا اور یہاں آتے ہی مام نے اسے جو خبر سنائی تھی وہ سننے کے بعد اسے عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا تھا۔ مام نے اسے بتایا تھا کہ عدیرہ کا پیغام آیا ہے اور غفران غازی بہت جلد اس رشتے کو پکا کرنے والے ہیں۔ حالانکہ عدین کو پتہ تھا کہ احتشام علی اور فائزہ علی دونوں کو ہی عدیرہ بے حد عزیز تھی اور دونوں کی دلی خواہش تھی کہ عدیرہ ان کی بہو بنے لیکن انھیں پتہ تھا کہ ان دونوں کی آپس میں کبھی نہیں بنی تھی۔ یہ پل دو پل کا ساتھ نہیں زندگی بھر کا ساتھ تھا......

عدین احتشام علی اس وقت اپنے بنگلے کی سیکنڈ فلور والی بالکونی میں کھڑا تھا اور مضطرب سا دودھیا چاند کو دیکھنے لگا...... اسے تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ اس کی بچپن کی دشمن اب ہمیشہ کے لیے اس سے دور ہو جائے گی...... وہ عدین جسے عدیرہ کو اذیت دے کر، اسے ستا کر مزہ آتا تھا، جو ہمیشہ سے اس کی ہر نئی چیز کو توڑ کر خوشی محسوس کرتا تھا۔ پھر اب کیوں یہ احساس ہی اس کے لیے جان لیوا تھا کہ عدیرہ غازی اس سے بچھڑ جائے گی۔ آج پھر کیوں اس عدیرہ غازی کے بغیر جینے کے تصور سے ہی اس کی دھڑکن رک سی رہی تھی...... عدین احتشام علی کو اپنی زندگی کی وہ دلکش بیتی ہوئی یادیں بہت تڑپا رہی تھیں، بچپن سے عدیرہ کے سنگ گزرا ہوا وہ وقت اسے بہت شدت سے یاد آ رہا تھا...... وہ شوخیاں، وہ شرارتیں، وہ لڑائیاں غرض کہ بچپن کے وہ سارے خوبصورت منظر اور حسین سے پل اس کی نظروں میں کسی فلم کی طرح گھوم رہے تھے۔ تتلیوں کے پیچھے بھاگنے والی وہ پاگل سی لڑکی جس کے ہر لمحے، ہر پل، ہر وقت کا ساتھی عدین احتشام علی تھا تو کیا اب اس کا ہمسفر کوئی اور ہوگا......؟ عدین احتشام علی پر یہ انکشاف ہو چکا تھا کہ وہ عدیرہ غازی سے محبت کرتا ہے کیونکہ جس سے ہم محبت کرتے ہیں اس سے ایک پل کی بھی دوری برداشت نہیں کر سکتے...... عدین عدیرہ کے لیے بچپن سے اپنے دل میں چھپی اس بے تحاشہ محبت کو جان ہی نہ پایا تھا لیکن کچھ پلوں میں ہی اسے یہ احساس ہوا تھا کہ عدیرہ غازی اس کی زندگی ہے اور اپنی زندگی کسی کو دان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے...... آج صبح سے عدیرہ اسے نظر نہیں آئی تھی۔ وہ کتنی دیر سے ایک ہی پوزیشن میں کھڑا تھا اور اس کی بے چین نظریں کب سے 'غازی منزل' کی بالکونی میں بھٹک رہی تھیں...... اس کے سچے جذبوں کی تڑپ تھی کہ پھر عدیرہ بالکونی میں چلی آئی۔ عدین دیوانہ وار اسے دیکھنے لگا۔ بلیک جینس پر ریڈ ٹاپ اور بلیک دوپٹہ اوڑھے وہ اسے آج بہت اداس سی لگی تھی۔ اس کی خوبصورت براؤن آنکھوں میں چمکتے موتی عدین سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ عدیرہ نے اسے دیکھ کر کچھ بھی نہیں کہا تھا، بس چپ چاپ بھیگی پلکوں سمیت اسے دیکھ رہی تھی۔ روز رات میں جب وہ دونوں اپنی اپنی بالکونی میں آتے تو ایک دوسرے پر کمنٹس ضرور پاس کرتے تھے لیکن آج پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بھی لڑے جھگڑے نہیں تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے فاصلے پر اجنبیوں کی طرح کھڑے تھے لیکن ان دو دیوانوں کے دل ایک ساتھ دھڑک رہے تھے...... محبت ان کے گرد اپنا حسار باندھے کھڑی تھی، محبت کی گرفت بہت مضبوط ہوتی ہے جب وہ کسی کو اپنی آغوش میں لیتی ہے تو پھر آخری سانسوں تک اسے اپنی گرفت سے آزاد نہیں ہونے دیتی۔ بچپن سے ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے والے دو دیوانوں کو محبت نے اپنی قید میں لے لیا تھا جس سے اب رہائی ممکن نہیں تھی...... عدیرہ اور عدین ایک دوسرے کو چپ چاپ کتنی دیر سے تکے جا رہے تھے۔ ایک دوسرے سے بچھڑ جانے کے تصور سے ہی ان کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں اور دل ماتم کر رہا تھا...... کچھ نہ کہہ کر بھی ان کی آنکھیں ایک دوسرے کو پیغام پہنچا چکی تھیں۔ عدیرہ نے اسے دیکھا اور پھر اندر چلی گئی جبکہ عدین وہیں کھڑا رہا...... عدیرہ بالکونی سے کیا گئی اسے ہر منظر ویران سا لگا۔ اگر عدیرہ کسی اور کی ہوگئی تو پھر وہ تو اس کے بغیر جی ہی نہیں پائے گا...... عدین احتشام علی ٹوٹا بکھرا سا ٹھنڈے ماربل پر بیٹھتا چلا گیا اور بے تحاشہ رونے لگا۔ ہمارے یہ قیمتی اور انمول آنسوؤں کے موتی صرف ان پیاروں کے لیے ہوتے ہیں جنھیں ہم زندگی بھر اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ جنھیں ہم کبھی کھونا نہیں چاہتے۔ عدین احتشام علی کا رواں رواں اپنے رب کے حضور میں دعا گو تھا کہ بس وہ پیاری سی لڑکی اس کا نصیب بن جائے۔

موسم بے حد خوبصورت ہو رہا تھا۔ شام 'غازی منزل' کے لان میں اتر آئی تھی۔ لان میں لگے سبز پیڑوں کی شاخوں پر پرندے چہچہا رہے تھے۔ پورے آسمان کو بادلوں نے گھیر رکھا تھا۔ عدیرہ غازی اداس سی لان میں کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اتنا خوبصورت موسم بھی اس پر اثر انداز نہیں ہو رہا تھا۔ آسمان کی وسعتوں میں سفید کبوتروں کے اڑتے ہوئے غول اس کی نگاہوں کی زد میں تھے۔ وہ ارد گرد سے اس قدر بیگانہ تھی کہ اسے اپنے قریب کسی کی آہٹ بھی محسوس نہیں ہوئی۔

''ہیلو پارٹنر ہاؤ آر یو۔'' ؟ عدین نے اس کی نگاہوں کے سامنے ہاتھ ہلایا تو وہ چونکی تھی۔

''ہم پارٹنر نہیں ہیں مسٹر عدین۔'' عدیرہ تلخ انداز میں بولتے ہوئے کرسی پر سے اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے ہی وہ آگے بڑھنے لگی تو عدین

نے اس کی کلائی پکڑ کر دوبارہ کرسی پر بٹھا دیا۔

''کہاں جا رہی ہو، بیٹھو یہاں...... مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

عدین بہت غور سے اسے دیکھتے ہوئے بولا جو وائٹ پلازو پر وائٹ لانگ ٹاپ اور وائٹ دوپٹے میں معصوم سی پری لگ رہی تھی۔ سیاہ بادلوں کی اونچی سی پونی بنی ہوئی تھی اور براؤن خوبصورت سی آنکھوں میں عجیب طرح کا حزن وملال بکھرا ہوا تھا۔

''میں لڑائی کے موڈ نہیں ہوں جو کہنا ہے جلدی کہو''...... عدیرہ نے اسے دیکھا جو پیار بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

'میں تم سے لڑنا نہیں چاہ رہا ہوں عدیرہ، بلکہ تمھیں اپنا ہم سفر بنانا چاہ رہا ہوں...... بولو عدیرہ غازی بنو گی میری ہم سفر''۔

عدیرہ کو اس کی آنکھوں میں آج عجیب سے جذبے نظر آ رہے تھے...... بلیک پینٹ پر ڈارک گرین ٹی شرٹ پہنے اپنی روشن سیاہ آنکھوں سمیت وہ بے حد اسمارٹ لگ رہا تھا۔

''بہت اچھا مذاق ہے تو اب اس طرح بدلہ لو گے مجھ سے''...... عدیرہ نے شکوہ کرتی نظروں سے اسے دیکھا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں یار۔ میں سیریس ہوں، مجھے خود ہی پتہ نہیں تھا کہ میں تمھیں کتنا چاہتا ہوں۔ میں ان لڑائیوں کے پیچھے چھپی محبت کو جان ہی نہیں پایا تھا لیکن یہ سچ ہے کہ میں تم سے بے تحاشہ پیار کرتا ہوں۔ بچپن سے میں نے اپنا ہر پل تمھارے سنگ بتایا ہے اور اپنی آخری سانسوں تک تمھارے سنگ اپنی زندگی بتانا چاہتا ہوں کیونکہ تم ہی سے ہے محبت، تم ہی سے ہے وفائیں...... تم ہی سے ہیں سانسیں...... بولو میرا ساتھ دے کر میری ان سانسوں کو چلنے دوگی یا پھر کسی اور کی ہو کر مجھ سے میری سانسیں چھین لوگی'' عدین کے لہجے میں نہ جانے کیسی تڑپ تھی...... عدیرہ نے بہت حیرانی سے اسے دیکھا، یہ وہ والا لڑکا عدین تو نہیں تھا جسے وہ بچپن سے جانتی تھی۔ یہ تو محبت کی باتیں کرنے والا کوئی اور ہی عدین تھا جس کی آنکھوں میں عدیرہ کے لیے محبت ہی محبت تھی۔

''ایسا ممکن ہی نہیں ہے عدین...... بچپن سے اب تک ایسا کوئی وقت نہیں ہوگا جو ہم نے ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے بغیر گزارا ہو۔ ہم ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے ہیں عدین''۔

عدیرہ نے اپنی آنکھوں کی نمی کو چھپانے کے لیے چہرہ موڑ لیا۔

''اللہ تعالی نے ہمیں ایک دوسرے کے لیے ہی بنایا ہے...... میں مانتا ہوں عدیرہ کہ ہمارا وقت ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے میں گزرا ہے لیکن ان لڑائیوں کے پیچھے چھپی محبت کو نہیں جانتی ہو تم...... ہم مستقبل میں بھی ایک دوسرے سے لڑنے لگے تو اس لڑائی میں بھی پیار ہوگا، محبت ہوگی، وفا ہوگی...... بولو عدیرہ کیا تم آخری سانسوں تک مجھ سے لڑنے کے لیے تیار ہو......؟ کیا تم مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار ہو۔ عدیرہ غازی''......

عدین نے چاہت بھری نظروں سے بہت آس سے اسے دیکھا۔

''آپ کو پتہ تو ہوگا کہ میرے لیے رشتہ آیا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے کہ پاپا اسے ہاں کہنے والے ہیں۔'' عدیرہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

اس رشتے کی فکر مت کرو۔ ہمارے گھر والوں کو ہماری خوشیاں عزیز ہیں۔ بس تم مجھے اتنا بتا دو کہ تم مجھ سے یہ پیار بھری لڑائیاں لڑنے کے لیے تیار ہو نا''؟ عدین نے پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ اس سے کہا۔

''بس میں آخری سانسوں تک آپ سے لڑنے کے لیے تیار ہوں کیونکہ آپ کے بغیر آپ سے لڑے بغیر میں کیسے جی پاؤں گی...... میری بھی سانسیں آپ کے ساتھ جڑی ہیں۔ اگر آپ میرے ہمسفر نہ بنیں تو میری سانسوں کے تار ٹوٹ جائیں گے...... میں بھی آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔'' عدیرہ غازی بھیگی پلکوں سمیت مسکرائی۔

''تھینک یو سو مچ مائی لو مائی لائف''۔ عدین احتشام علی جیسے جی اٹھا۔

''اگلے مہینے ہماری سالگرہ آ رہی ہے میں پاپا سے کہتا ہوں کہ وہ اسی دن ہماری شادی کر دے...... پھر ہم اپنی سالگرہ اور شادی کی سالگرہ ایک ہی دن ایک ہی ساتھ منائیں گے؟''۔

عدین بے تحاشہ خوش ہوتے ہوئے کہہ رہا تھا...... کچھ دیر بعد وہ کھلکھلاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے پورے لان میں دوڑ رہے تھے۔ ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے پیار ہی پیار تھا، ایک دوسرے کی سچی تڑپ تھی۔ ان کے والدین نے اپنے اپنے بنگلوں کی سیڑھیوں پر سے انھیں محبت کی بارشوں میں بھیگتے ہوئے دیکھا تو وہ طمانیت سے مسکرا دیے کیونکہ بچپن سے ساتھ رہنے والے اب بہت جلد ہمیشہ کے لیے ایک ہونے والے تھے۔

□□□

Rumana Iffat Rahi
D/o . Shaikh Bilal
Hirapura, Near Masjid Darus Salam
Achalpur City
Distt. Amravati-444806 (M..S)

استوتی اگروال

تمھارے نام!

میری پیاری سہیلی رجنی........

ایک زمانہ تھا جب تم اور میں اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے اور اتفاق سے ہم دونوں ہی کلاس میں اول آیا کرتے تھے۔ تم بہت ذہین تھیں، ہنس مکھ تھیں، پیارے پیارے لطیفے سنا کر سب کو ہنسایا کرتی تھیں، اسکول کے سبھی ٹیچر سے خوب چٹ پٹی باتیں کرتیں تھیں، اور سبھی لڑکیاں بھی تم سے بہت محبت کرتی تھیں۔ تمھاری ذہانت، چلبلا پن، لطیفے بازی آج بھی لوگوں کو یاد ہے۔ میں کیسے بھول سکتی ہوں کہ ہم دونوں پورے اسکول کی جان تھے، سارے ٹیچر ہمیں سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھتے تھے۔ کھیل کا میدان ہو، پڑھائی کا میدان ہو، اسکول میں تقریر کرنا ہو، یا کوئی بحث و مباحثہ ہم دونوں ہمیشہ اوّل آتے تھے۔ ہم دونوں بہت پرانے دوست تھے اور بچپن سے ہی اس اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ ہم اکثر ایک دوسرے کے گھر جاتے تھے اور خوب باتیں کرتے، کبھی کبھی تو رات بھی ہو جاتی تھی لیکن گھر والوں نے تمھارے ساتھ بہت زیادتی کی اور پندرہ سال کی عمر میں ہی تمھاری شادی کرادی۔ تم تو ڈاکٹر بننا چاہتیں تھیں، لوگوں کی خدمت کرنا چاہتیں تھیں، اپنا خواب پورا کرنے کے لیے تم دن رات محنت کرتیں تھیں۔ تمھاری کوئی خیر خیریت نہیں ملتی۔ میں نے تم سے رابطہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن تمھارا پتہ مجھے نہ مل سکا۔ آج جب میں اپنے ماما کے یہاں شادی میں ہوشنگ آباد گئی تو تمھاری امی سے میری ملاقات ہوئی اور انھوں نے تمھاری شادی کی خبر دی۔ ان سے پتہ لے کر میں تمھیں خط لکھ رہی ہوں۔

دعاؤں میں یاد رکھنا۔ پیاری سہیلی۔ استوتی

پیاری دوست۔ استوتی

امید ہے تم وہاں پر خیر و عافیت سے ہوں گی۔ جب میں نے تمھارا خط پڑھا تو مجھے رونا آ گیا اور خیریت کا میں تمھیں کیا بتاؤں۔ میں اپنی قسمت تو بدل نہیں سکتی۔ دو بچے ہیں جن کی اسکول کی فیس، کھانا پینا سب مجھے ہی کرنا پڑتا ہے کیونکہ میرا شوہر کچھ کماتا ہی نہیں ہے، بلکہ میری کمائی کے پیسے بھی مجھ سے مار پیٹ کر لے جاتا ہے۔ میں تھوڑے بہت پیسے ٹیوشن پڑھا کر جمع کر لیتی ہوں اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر لیتی ہوں۔ کاش! میں پڑھ لکھ لیتی اور آج اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی تو مجھے اپنے شوہر کا محتاج نہیں ہونا پڑتا۔ اب میں اس انتظار میں رہتی ہوں کہ کب وہ کمائے گا، لیکن جو کچھ میں نے تمھارے ساتھ پڑھا لکھا اس کی وجہ سے میں ٹیوشن کر لیتی ہوں۔ کچھ بچوں کو پڑھا لیتی ہوں۔ واقعی میرے ماں باپ نے بہت ناانصافی کی۔ میرے سپنوں کا گلا گھونٹ دیا گیا، میں روتی رہی، لیکن کسی نے میری ایک نا سنی۔ اب میں اپنی قسمت پر روؤں... کیا کروں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔ بھگوان نے میری قسمت یہی لکھی ہے جو مجھے نا چاہتے ہوئے بھی قبول کرنی پڑے گی۔ اب میں اس سے آگے کچھ نہ لکھ پاؤں گی۔

تمھاری دوست۔ رجنی

رجنی کا خط پڑھ کر میں سکتے میں آ گئی اور مجھے اس کا وہ ہنستا ہوا چہرہ اور چلبلا پن یاد آ گیا جب وہ اور میں اسکول میں ایک ساتھ پڑھتے تھے تب وہ کتنی شوخ تھی۔ جھکنا تو وہ جانتی ہی نہ تھی۔ اسکول میں اگر کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتی تو وہ لڑ بیٹھتی تھی۔ لیکن پندرہ سال کی عمر میں اس کے ماں باپ نے شادی کر کے اس پر بڑا ظلم کیا اور آج وہ کس مپرسی کی زندگی گذار

رہی ہے حالانکہ حکومت نے ہی اٹھارہ سال سے کم عمر کی لڑکی کی شادی پر پابندی لگا دی ہے۔ یہ ایک سنگین جرم مانا جاتا ہے، لیکن اب بھی کچھ برادریوں میں یہ رواج موجود ہے۔ خاص طور پر راجستھان میں یا مسلمانوں میں گدی برادری میں اور ہندوؤں میں آدی واسی یا دیگر برادریوں میں اب بھی خاموشی سے نابالغ لڑکیوں کی شادی کر دی جاتی ہے۔ میں اس کا خط پڑھ کر بہت گہری سوچ میں مبتلا ہوگئی اور میں نے اسے ایک تفصیلی خط لکھا......

میری ہر دلعزیز دوست.....رجنی

تمھاری خیریت تو میں جان چکی ہوں، لیکن تم نے خط میں جو لکھا اسے پڑھ کر مجھے تم پر غصہ آیا۔ تم اس طرح ہمت ہار جاؤ گی تو ہم دوسروں سے کیا امید کریں گے۔ تمھیں تو پتہ ہی ہے ہمارا سماج آج بھی لڑکیوں کو ایک بوجھ سمجھتا ہے۔ ماں باپ لڑکیوں کی جلد سے جلد شادی کر کے اپنا بوجھ ہلکا کر دینا چاہتے ہیں، جبکہ بیٹوں سے زیادہ بیٹیاں اپنے ماں باپ کا زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ پرائے گھر چلی جاتی ہیں، لیکن وہ اپنے ماں باپ کو نہیں بھول پاتیں اور جب بھی خدمت کا موقع ملتا ہے تو اسے نبھاتی ہیں، پھر بھی ہر ماں باپ اپنی بیٹی کی جلد سے جلد شادی کر کے اپنے سر سے ذمے داری کا بوجھ اتار دیتے ہیں۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں.............؟ آج بھی ہمارے سماج میں لڑکوں کے پیدا ہونے پر جشن منایا جاتا ہے اور بیٹیوں کے پیدا ہونے پر گھر میں کوئی خوش نہیں ہوتا، پہلے تو لڑکیوں کو زندہ تک دفن کر دیا جاتا تھا یعنی بے قصور لڑکیوں کا وجود ہی ختم کر دیا جاتا تھا جو اس دنیا میں آئی تک نہیں، لیکن آج ہم سائنسی دور میں جی رہے ہیں پھر بھی کئی گھروں میں Foeticide یعنی لڑکی کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اسے مار دیا جاتا ہے۔ کیوں....؟ کیا بیٹیاں کچھ کر نہیں سکتیں...؟ لیکن پھر بھی ہمارے سماج میں لڑکوں کو اعلیٰ درجہ دیا جاتا ہے اور یہ مانا جاتا ہے کہ وہ ہماری نسل کو آگے بڑھائیں گے...؟ میرے گھر میں بھی مجھے سکھایا جاتا ہے کہ لڑکیوں کو جھک کر رہنا چاہیے، زیادہ بولنا لڑکیوں کے لیے مناسب نہیں ہوتا... لیکن کیوں؟ اس کا جواب مجھے کون دے گا...؟ کبھی جب میں اپنے بھائی سے لڑ پڑتی ہوں تو مجھے ڈانٹ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ وہ لڑکا ہے اور تم لڑکی ہے تمھیں جھک کر رہنا ہوگا۔ یہ کون سا طریقہ ہے کوئی اس کا جواب دے گا......جب رانی لکشمی بائی نے انگریزوں سے آزادی کے لیے لڑائی لڑی، ایک عورت ہوتے ہوئے بھی ہتھیار اٹھائے، سارے مردوں کو پیچھے چھوڑ دیا اور وہاں کی عورتوں کو بھی لڑنا سکھایا اور یہ ہدایت دی کہ لڑکیاں یا بیٹیاں جب آگے بڑھتی ہیں تو دنیا ہارنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ رانی لکشمی بائی کے علاوہ کئی ایسی مثالیں ہیں کلپنا چاولا نے چاند پر قدم رکھا، سائنا نہوال نے بیڈمنٹن سے اپنا مستقبل بنایا، ہیلن کیلر جو نہ ہی دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی سن سکتی تھی اس نے کئی اہم کتابیں لکھ ڈالیں۔ جے کے رولنگ کی کتاب کوئی پبلیشر نہیں چھاپ رہا تھا اور کئی بار اسے Rejection کا سامنا کرنا پڑا، لیکن اس نے بھی ہمت نہیں ہاری اور ہیری پاٹر جیسی کتاب لکھی۔ تم کیسے اتنی جلدی ہار مان گئیں رجنی..؟۔ ہمیں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینا ہوگا۔ اب اور نہیں......ہم کیوں ظلم برداشت کریں......کیا ہم کسی کے قرض دار ہیں...؟ عورت ایک ماں، بیٹی، بہن، سب ہوتی ہے، عورت نے کیا کچھ نہیں سہا ہے۔ کسی نے بالکل سچ کہا ہے......

''ظلم کرنے سے زیادہ، ظلم سہنا برا ہے''۔

ہم اب آگے بڑھیں گے اور ان لوگوں کا منہ بند کرائیں گے جنھوں نے ہمیں حقارت کی نظروں سے دیکھا ہے۔ اب ہم ظلم برداشت نہیں کریں گے.... سماج میں اپنا وہ مقام حاصل کر کے رہیں گے جو ہمیں ملنا چاہیے، کب تک ہم اپنے ادھورے خوابوں کے سہارے جئیں گے۔ رجنی امید کرتی ہوں جلد ہی تمھارا ایسا جواب ملے گا جو ایک انقلاب پیدا کر دے گا۔ اپنا خیال رکھنا۔

استوتی......

کئی دنوں تک میں رجنی کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ ایک دن اچانک پوسٹ مین آیا تو میں خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ فوراً ہی میں نے خط پڑھا جس میں لکھا تھا...

'' استوتی.....تمھارے خط نے مجھے وہ حوصلہ دیا جس کی مجھے ضرورت تھی۔ اب میں نے بھی عہد کر لیا کہ میں کوئی ظلم نہیں سہوں گی اور اپنی پڑھائی جاری رکھوں گی میں نے اپنی منزل کا تعین کر لیا ہے جسے میں کیسے بھی حاصل کر کے رہوں گی۔ میں اپنے بچوں کو لے کر جا رہی ہوں اور تمھیں خط تب ہی لکھوں گی جب میں ایک ڈاکٹر بن جاؤں گی۔

دعاؤں میں یاد رکھنا۔ رجنی

رجنی کا خط پڑھ کر میری خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہا اور میں نے کہا؛ ''چلئے میرے خط سے ایک انقلاب تو پیدا ہوا''۔ □□□

Stuti Agrawal
Agrawal Jewellers
Sironj -464228 (MP)

تبسم فاطمہ

نیوزی لینڈ سانحہ کے نام

(1)

جب سجدے لہو میں بھیگے تھے
میں آسمان دیکھ رہی تھی
کچھ بادلوں کے آوارہ ٹکڑے تھے
جو آہستہ آہستہ چہروں میں تبدیل ہو رہے تھے
ان کے سر پر ٹوپیاں تھیں
میں نے پہلی بار قطب تارے کو سجدے میں دیکھا
اور اذان کی آواز سنی
بے حد صاف وشفاف
میں آسمان کو دیکھ رہی تھی
روشن ٹوپیاں
جھلملاتے ستاروں سے کھیل رہی تھیں
ستاروں نے ٹوپیاں پہن رکھی تھیں

(2)

رات کہیں دور رہ گئی تھی
جب مقدس نظاروں کے درمیان
زمین پر خون کی سرخی پھیلی تھی
کچھ مائیں تھیں
جن کے الاپ سے سمندر میں لہریں اٹھ رہی تھیں
کچھ بہنیں تھیں
جو جوتے اور چپل کی شناخت کر رہی تھیں
کچھ عورتیں تھیں،
جو مسجد کی دیواروں کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھیں
کچھ لوگ تھے، مبہوت
اور آسمانی آیتوں کا ورد کر رہے تھے
رات کہیں دور رہ گئی تھی
رات اس آلودہ موسم میں
مقدس لہو کے درمیان آنے کو تیار نہیں تھی

توشب آفریدی

ماں بتاتی تھی،
پیدا ہوتے ہی اتنا روئی تھی
کہ آسمان نیلا پڑ گیا
میری آمد سے چھکنے والے چہرے
خزاؤں کا حساب لگاتے ہوئے
برآمدے میں امرود سے گرنے والے سوکھے
پتوں کو دیکھ رہے تھے
تب کی بات ہے
جب آنگن میں گوریا آتی تھی
منڈیر پر بیٹھے ہوتے تھے کوے
اور کبھی کبھی امرود کے پیڑوں سے
چھپی کویل کی کوک بھی سنائی دے جاتی تھی......
تب پہلی بار
گھر میں ہوئی پہلی موت کی دستک سنی تھی میں نے
آنگن میں گوریے، کوے اور چڑیوں کو
ہکانے والے ددا کے ہاتھ بے جان تھے
بے روح اور بے جان ہوتے جسم سے پہلے
روح میں اترنے گھرنے والی
درد کی آواز سنی تھی میں نے/
عمر کے خزاں ہوتے احساس کو دیکھ کر
اچانک میں ٹھہر گئی ہوں
پیدائش سے موت تک
درد میں پھیلے گھیرے میں
سمٹی ہوتی ہے زندگی
راز کا جال بنتی
مکڑے کی طرح
ایک دن
جال رہ جاتا ہے
دور کھو جاتی ہے ایک رہگزر
اور جسم غائب ہو جاتا ہے

قبرگاہوں کی ویران سلطنت

میں نہیں جانتی
مجھے یہ جگہ کیوں پسند ہے
یہاں چھوٹی بڑی کھلی ہوئی قبروں کی ایک قطار ہے
لیکن یہاں بھی
غریبی اور امیری کی جنگ ایک جیسی ہے
پکی اور شاندار قبروں کے درمیان
کچی قبریں بھی ہیں
بارش کے پانی میں ڈھ جانے والی قبریں

ایسی بھی ہیں جہاں سنگ مرمر لگے ہیں
ناموں کے کتبے سجے ہیں
اور ایسی دھنسی ہوئی قبریں بھی
جن کی یادیں ایک بھی برسات نہیں جھیل پاتیں
پتہ نہیں
اب ان کے عزیز
شہر خموشاں میں ان سے ملنے آتے بھی ہیں یا نہیں
پیڑوں کے پتے سے
قطار میں بنی قبروں تک
پھیلا ہوا گہرا سناٹا ہے
میں اس سناٹے میں چنتی ہوں یادوں کے پھول
میں اس خاموشی میں تلاش کرتی ہوں پاؤں کے شول
ہوا میں پاتی ہوں گرد اور دھول
شاید یہی ہے زندگی کا معمول

قبرگاہوں کی اس ویران سلطنت میں
کئی اور بھی ہیں جنہیں میں جانتی تھی
جن کے ہاتھوں پر کھیلی تھی
جن کے پاؤں پر چلتی ہوئی بڑی ہوئی تھی
یہاں وہ سب ہیں
جو اس سلطنت سے باہر کی دنیا سے
گھبرا گئے تھے
پھر ہمیشہ کے لیے آنکھیں موند کر
اس سلطنت کے ہو کر رہ گئے

یہاں اچھا لگتا ہے مجھے
بھٹکتی ہوئی روحوں کی تلاش
ہوا سے ہلتے ہوئے پیڑ
خزاں سے گرتے ہوئے سوکھے پتے
اور پراسرار گہری خاموشی
میں اس خاموشی میں چھٹک گئی ہوں
انہی راستوں میں کہیں بھٹک گئی ہوں
میرے چاروں طرف
ایک نہ ختم ہونے والی دھند ہے
یقین نہیں ہوتا
میں اس کہرے میں ہی کہیں
اٹک گئی ہوں

Tabassum Fatima
D-304 Taj Enclave
Geeta Colony
Delhi - 110031

عصمت آرا

گیت

ہرے آم کے پیڑ کے نیچے آس لگائے کھڑی بروگن
سانجھ بھئی اور آج بھی اب تک کیوں نہ آئے مورے ساجن
انگ انگ یہ جھلس رہا ہے
ساجن بن من تڑپ رہا ہے
کاگا ان سے جاکر کہہ دے
بہت سہا اب آجا بالم
کوئل نے جب کوک سنائی اور بڑھی ہے دل کی دھڑکن
سانجھ بھئی اور آج بھی اب تک کیوں نہ آئے مورے ساجن
موسم بھی کتنا پیارا ہے
پتاپتا جھوم رہا ہے
ساری سکھیاں جھولا جھولیں
سب کے دل میں لڈو پھوٹیں
سن کر طبلے جھانجھ منجیرے تڑپ اٹھی ہے ایک ابھاگن
سانجھ بھئی اور آج بھی اب تک کیوں نہ آئے مورے ساجن
آگ لگائے رت مستانی
نین ہوئے ہیں پانی پانی
من کا کاگا بول رہا ہے
جاگ اٹھی ہے پریت پرانی
مانگ میں بھر کے لال سندوری کھڑی ہے بےکل ایک سہاگن
سانجھ بھئی اور آج بھی اب تک کیوں نہ آئے مورے ساجن
جب جب کوئی پپیہا بولے
دل میں ڈر کی کھڑکی کھولے
آنکھوں کے آگے رہ رہ کر
سوتن کی پرچھائیں ڈولے
آشاؤں کے دیپ جلائے رٹتی رہتی ساجن ساجن
سانجھ بھئی اور آج بھی اب تک کیوں نہ آئے مورے ساجن

Ismat Ara
Flat No.306, T.Khan Complex,
Chunashah Colony, Azad Nagar
Jamshedpur-832110 (Jharkhand)

لذیذ پکوان

سبزیوں کا نوابی سالن

گاجر دو سو پچاس گرام، پھول گوبھی دو سو پچاس گرام، تازہ پھلیاں دو سو پچاس گرام، چینی ایک کھانے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، پانی ایک کپ

گریوی کے اجزا

ٹماٹر کی پیوری دو سو پچاس گرام، پیاز ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)، بادیان کے پھول دو عدد، دار چینی ایک ٹکڑا، زیرہ ایک چائے کا چمچ، کٹی لال مرچ آدھی چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، ہلدی آدھا چائے کا چمچ، خشخاش چار کھانے کے چمچ، سبز الائچی دو عدد، املی کا پلپ آدھا کپ، ہری مرچ کا پیسٹ دو کھانے کے چمچ، تیل آدھا کپ

تمام سبزیاں چینی، نمک اور ایک کپ پانی کے ساتھ اُبال لیں۔ دیگچی میں تیل گرم کر کے زیرہ اور پیاز فرائی کریں۔ پھر اس میں ٹماٹر کی پیوری، سبز الائچی، خشخاش، ہلدی، ہری مرچ کا پیسٹ، کٹی لال مرچ، نمک، دار چینی اور بادیان کے پھول ڈال کر بھونیں۔ سبزیاں ڈال کر مکس کریں۔ ڈھانپ کر بیس منٹ پکائیں اور آخر میں املی کا پلپ ڈال کر چولہے سے ہٹا لیں۔ روٹی کے ساتھ پیش کریں۔

اچاری کریلا

کریلے آدھا کلو، پیاز ایک کپ، تیل آدھا کپ، املی تین سے چار ٹکڑے، ادرک لہسن کا پیسٹ ایک چائے کا چمچ، لال مرچ ایک چائے کا چمچ (پسی ہوئی)، ہلدی آدھا چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، دہی آدھا کپ (پھینٹی ہوئی)، چینی ایک چائے کا چمچ

اچاری مصالحہ کے لیے

سفید زیرہ ایک چائے کا چمچ، کلونجی ایک چائے کا چمچ، میتھی آدھا

چائے کا چمچ (سوکھی)، دھنیا دو چائے کے چمچ (سوکھا)، سونف ایک چائے کا چمچ

اچاری مصالحہ کے لیے: توے پر سفید زیرہ، کلونجی، سوکھی میتھی، سوکھا دھنیا اور سونف کو بھونیں اور باریک پیس لیں۔

کریلے کے لیے: کریلوں کو چھیلیں اور ان کے بیج نکال دیں۔

اب ان پر نمک لگا کر ایک گھنٹے کے لیے چھوڑ دیں۔ پھر اچھی طرح دھولیں۔ اس کے بعد کریلوں کو پانی میں املی کے ساتھ پانچ منٹ کے لیے اُبالیں۔ اب انھیں نچوڑ کر تمام پانی نکالیں اور تیل میں فرائی کر کے نکال لیں۔ اب تیل گرم کر کے اس میں پیاز کو لائٹ گولڈن کریں اور نکال لیں۔ پھر اس میں ادرک لہسن کا پیسٹ، پسی لال مرچ، ہلدی، نمک اور دہی شامل کر کے کریلے فرائی کر لیں۔ ساتھ ہی تلی پیاز، چینی اور بھنا پسا مصالحہ ڈال دیں۔ اس کے بعد ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکائیں، یہاں تک کہ وہ تیار ہو جائے۔

چٹنی سبزی پلاؤ

بون لیس چکن ایک کلو، باریک کٹی ادرک دو کھانے کے چمچے، ہری مرچیں دس عدد، پسے ٹماٹر ایک کپ، ٹومیٹو کیچپ آدھا کپ، باریک کٹی پیاز ایک عدد، ہلدی ایک چائے کا چمچ، کٹا زیرہ دو چائے کے چمچے، پسا گرم مصالحہ ایک چائے کا چمچ، نمک ایک چائے کا چمچ، لیموں کا رس چار عدد، سویا سوس دو کھانے کے چمچے، کٹی لال مرچ ایک چائے کا چمچ، چلی سوس دو کھانے کے چمچے، تیل آدھا کپ

بلینڈر میں املی کا رس، ابلے ٹماٹر، ہری مرچیں، ٹومیٹو کیچپ، زیرہ اور پودینہ ڈال کر پیس لیں۔

چاول

تمام سبزیوں کو باریک چوپڈ کر کے گرم تیل میں فرائی کریں۔

اب ان میں کالی مرچ اور نمک ڈال کر نکال لیں۔

پھر اسی پتیلی میں چاول ڈالیں اور سبزیوں کی لیئر دیں۔

اس کے بعد چٹنی ڈالیں اور اس طرح ایک اور لیئر دیں۔

آخر میں دس منٹ دم پر رکھ کر چولہا بند کر دیں۔

چٹنی سبزی پلاؤ تیار ہے۔

بنانا سور(Sour) کریم بریڈ

چینی ایک کپ، دار چینی آدھا چائے کا چمچ، انڈے دو عدد، کیلے چار عدد میش کیے ہوئے، سور کریم آدھا کپ، ونیلا ایکسٹرکٹ ایک چائے کا چمچ، نمک آدھا چائے کا چمچ، بیکنگ پاؤڈر ایک چائے کا چمچ، میدہ دو کپ، اخروٹ ایک کپ باریک کٹے ہوئے

اون کو تین سو ڈگری سینٹی گریڈ پر گرم کر لیں۔

نو سے پانچ انچ لوف پین کو مکھن اور میدے سے گریس کر لیں۔

چینی اور مکھن کو اچھی طرح مکس کریں۔

اس میں انڈے، میش کیے ہوئے کیلے، کریم، ونیلا ایکسٹریکٹ اور دار چینی کو مکس کریں۔

اب اس میں نمک، بیکنگ پاؤڈر اور میدہ شامل کریں اور اچھی طرح مکس کریں۔

اخروٹ شامل کر دیں۔

اب اس بیٹر کو گریس کیے ہوئے پین میں ڈالیں اور ایک گھنٹے کے لیے یا جب تک اوپر والی سطح سنہری نہ ہو جائے اور ٹوتھ پیک اندر کرنے پر صاف باہر نا آئے۔

□□□

(بحوالہ: www.khanapakana.com)

نظام ہضم اور تحلیل غذا

شکیل احمد

انسان خوراک کو دو ذرائع، نباتات اور حیوانات سے حاصل کرتا ہے۔ خوراک کھانے کے بعد جسم میں چھوٹے اور آسان کیمیاوی اجزا میں ٹوٹ جاتی ہے اور پھر جسم کی باریک نلیوں اور خلیوں کے ذریعہ جذب ہوکر جسم کے مختلف حصوں میں پہنچ کر استعمال ہوتی ہے۔ اس سے خون بنتا ہے جو آکسیجن سے مل کر صاف ہوتا ہے اور بدن کے تمام حصوں میں دورہ کرتا ہے۔ انھیں اجزائے غذا سے جسم کی نشوونما ہوتی ہے اور کام کرنے کے لیے توانائی حاصل ہوتی ہے۔

جسم میں خوراک منھ سے داخل ہوکر زبان اور دانتوں کے درمیان پستی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ منھ سے ہی ہاضمہ کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ کھانے کو چباتے وقت منھ سے لعاب (رال Saliva) تین مختلف گلٹیوں سے نکل کر اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ دن بھر میں تقریباً ایک لیٹر لعاب آدمی کے منھ سے نکلتا ہے، جس کی مقدار کھانا چباتے وقت زیادہ ہوتی ہے۔ اس میں تقریباً 99.5 فیصدی پانی ہوتا ہے۔ لعاب دہن میں میوسن (Mucin) نام کی ایک پروٹین ہوتی ہے جس کا کام غذا کو چکنا بناتا ہے۔ لعاب میں ایک کیمیاوی خمیر (انزائم) ہوتا ہے جس کا نام سلائیور امائلیز یا ٹائلن (Ptialin) ہے۔ اس کا کام اسٹارچ اور گلائیکوجن کو پہلے ڈکسٹرن اور بعد میں شکر کی ایک مالٹوز میں بدلنا ہے۔ اسٹارچ کو ہضم ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ لگتا ہے اس لیے غذا کو دانتوں سے چبا کر کھانا چاہیے۔ اس سے خوراک خوب باریک ہو جاتی ہے اور اس میں لعاب اچھی طرح کافی مقدار میں شامل ہو جاتا ہے۔

ٹائلن کا اثر معدہ میں بھی اس وقت تک رہتا ہے جب تک کہ معدہ کی تیزابی رطوبت آکر غذا میں شامل نہیں ہو جاتی۔

جب کھانا منھ سے آگے بڑھتا ہے تو سانس کی نلی کا سوراخ بند ہو جاتا ہے اور کھانے کی نلی کا سوراخ مری ایسوفیگس (Esophagus) کھل جاتا ہے۔ اس کے بعد کھانا معدہ میں داخل ہوتا ہے۔ سانس اور کھانے کی نلیاں ایک ہی جگہ ملتی ہیں اگر کسی وقت ذرا سی غذا بھی سانس کی نلی میں چلی جائے تو فوراً چھینک اور کھانسی آجانے سے باہر نکل جاتی ہے۔ معدہ کے اندر غذا میں کئی رطوبت (Gastric Juices) اور نمک کا تیزاب (HCL) آکر شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے معدہ کے سیال تیزابی ہوتے ہیں اور ان کا پی ایچ 1 سے 2 کے درمیان ہوتا ہے۔ ان سیال کی وجہ سے بہت سے جراثیم (Bacteria) معدہ میں ختم ہو جاتے ہیں عصیر معدہ معدی غدود سے نکل کر آتے ہیں۔ ان کے نکلنے کی وجہ خوراک کی خوشبو، ذائقہ اور ایک ہارمون گیسٹرن (Gastrin) کا اثر ہے۔ عصیر معدہ میں تقریباً 99 فیصدی پانی ہوتا ہے۔ اس رقیق میں میوسن بھی ہوتی ہے جو غذا کو چکنا بناتی ہے اور تقریباً 9.3 فیصدی نمک کا تیزاب ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے انزائم ہوتے ہیں۔ جن میں خاص یہ ہیں:

(1) پیپسین (Pepsin): یہ انزائم پروٹین کو اور چھوٹے کیمیاوی اجزا پیپٹائنس (Peptones اور Protdoses) میں تبدیل کرتا ہے۔

(2) رینین (Renin): یہ انزائم دودھ کے خاص جز کیسین (Casein) جو از قسم پروٹین ہے کی ترویب (Doagulate) کرتا ہے۔

(3) گیسٹرک لائپیز (Gastric Lipase): یہ انزائم محلول شحمیات کو اور مختصر اجزا شحمی تیزاب (Patty Acids) اور گلیسرین میں تبدیل کرتا ہے۔ ایک آدمی دن بھر میں تقریباً دو سے تین لیٹر تک عصیر معدہ نکالتا ہے۔

معدہ سے غذا (Pylorie Valve) کے ذریعہ چھوٹی آنت میں پہنچتی ہے۔ آنت تقریباً 25 فٹ لمبی ہوتی ہے۔ خوراک کے آنت میں آنے پر امعائی رس (Intestnial Juices) آ کر اس میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ رس کھاری ہوتے ہیں اور ان میں بائیکاربونیٹ بہت بڑی مقدار میں ہوتے ہیں جو معدہ سے آئے تیزابی مادہ کی تاثیر کو ختم کر کے اس کا پی ایچ 7.5 سے 8.2 تک کر دیتے ہیں۔ چھوٹی آنت میں کئی انزائم کام کرتے ہیں۔ یہاں دو رقیق رطوبت لبلبہ (عصیر بانقراس) اور پت (بائل) بہت اہم ہیں۔

جگر سے پت چھوٹی پت نلی کے ذریعہ آ کر پتہ Gall Bladder میں جمع ہوتا ہے جہاں سے یہ بڑی پت نلی کے ذریعہ اوسطاً آدھ لیٹر سے ایک لیٹر تک روزانہ چھوٹی آنت میں پہنچتا ہے اور غذا میں شامل ہوتا ہے۔ پت ہرے پیلے رنگ کا رقیق ہوتا ہے جس میں بائل سالٹس (Bile Salts) ہوتے ہیں۔ یہ چربی کو چھوٹے چھوٹے قطروں کی شکل میں محلول کرتا ہے۔ کلوسٹرال، بالکل بائل ایسڈ کا پیش رو (Precursor) ہے۔ اگر پت نلی میں رکاوٹ یا کسی خرابی کی وجہ سے پت کا نکالنا رک جاتا ہے تو وہ خون میں شامل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے یرقان (Gaundice) کا مرض پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے جسم کی کھال کا رنگ زرد ہو جاتا ہے۔ پت کا رنگ پیشاب میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔

معدہ سے آئے نمک کے تیزاب کی وجہ سے آنتوں کی دیواروں سے ایک ہارمون سیکریٹین (Secretin) نکلتا ہے جو خون کے لبلبہ یانقراس میں جاتا ہے جس کی وجہ سے لبلبہ سے زرد رنگ کی رطوبت عصیر بانقراس (Pancreatitis Juice) نکل کر پت کی بڑی نلی کے ذریعہ چھوٹی آنت میں آ کر شامل ہوتی ہے۔ روزانہ تقریباً آدھ لیٹر سے ایک لیٹر تک رطوبت لبلبہ خارج ہوتی ہے۔ اس رقیق میں کاربونیٹ کی موجودگی نمک کے تیزاب کے اثر کو ختم کر کے اس کو کھاری بنا دیتی ہے۔ رطوبت لبلبہ میں مندرجہ ذیل انزائم ہوتے ہیں:

(1) ٹرپسین (Tripsin): یہ پروٹین اور پیپٹونس کو امینوایسڈ میں توڑتا ہے۔

(2) لائی پیز (Lipas): یہ چربی کو فیٹی ایسڈ اور گلسرین میں تبدیل کرتا ہے۔

(3) امائی لیز (Amylase): یہ اسٹارچ کو آسان شکر میں تبدیل کرتا ہے۔

ان کے علاوہ چھوٹی آنت میں کئی انزائم عمل کرتے ہیں۔ اریپسن (Erepsin) پروٹین اور پیپٹونس کو مزید توڑ کر امینو ایسڈ میں بدلتا ہے۔ مندرجہ ذیل انزائم کاربوہائیڈریٹ پر کام کرتے ہیں۔ مالٹیز، مالٹوز کو گلوکوز میں سکریز، سکروز کو گلوکوز اور فرکٹوز میں اور لیکٹیز، لیکٹوز کو گلوکوز اور گیلیکٹوز میں تبدیل کرتے ہیں۔ اس طرح پروٹین امینو ایسڈ میں کاربوہائیڈریٹ چھوٹی شکر میں اور چربی محلول ہو کر فیٹی ایسڈ اور گلیسرول میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو آسانی سے چھوٹی آنت کی دیواروں کے ذریعہ جذب ہو کر خون اور لمف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

بیکار اور بغیر جذب ہوئی غذا بڑی آنت میں پہنچتی ہے یہاں اس کا پانی جذب ہو جاتا ہے اور فضلہ اجابت کی شکل میں جسم سے خارج ہو جاتا ہے۔ اجابت بیکار بچی ہوئی غذا، جراثیم، بلغم، لعاب، آنو اور کردہ خلیوں کا مجموعہ ہے جو مختلف اوقات میں مقعد سے خارج ہوتی رہتی

ہے۔اجابت کا رنگ پت کے رنگ کی وجہ سے ہوتا ہے خوراک کو منہ سے چل کر چھوٹی آنت کے آخر تک پہنچنے میں تقریباً ساڑھے چار گھنٹے لگتے ہیں۔لیکن اجابت کے خارج ہونے تک تقریباً24 گھنٹے لگ جاتے ہیں، اس دوران جراثیم بہت اثر انداز ہوتے ہیں۔جو جراثیم معدہ کے تیزابی اثر سے بچ جاتے ہیں وہ آگے چل کر تعداد میں بہت بڑھ جاتے ہیں اور آخر میں بہت گندگی اور نقصان دہ چیزیں پیدا کرتے ہیں جس سے بدبودار گیس پیٹ میں پیدا ہوتی ہے۔خشک اجابت کا تقریباً25 فیصدی وزن جراثیم کی وجہ سے ہوتا ہے۔

انجذاب غذا(Absorption): ہضم ہوئی غذا خاص طور سے چھوٹی آنت میں جذب ہو کر جسم کے مختلف حصوں میں پہنچتی ہے۔چھوٹی آنت کھردری ہوتی ہے اور اس کی اندرونی دیوار میں انگلیوں کی طرح بے شمار ابھار ہوتے ہیں جنھیں انگشت زائدہ(Willi) کہتے ہیں۔آنت کی کھردری سطح اور انگشت زائدوں کی وجہ سے چھوٹی آنت میں غذا جذب ہو جاتی ہے۔جسم میں غذا پہنچ کر اعضا کو بنانے اور توانائی (کیلوری) کے لیے استعمال ہوتی ہے آنت میں غذا کا جذب ہونا دو وجھوں سے ہوتا ہے۔اول انتخابی سرایت پذیری (Selective Permeability) اور دوسرے موثر نقل وحمل (Active Transport) آنتوں کی دیواریں نصف سرایت پذیر جھلی (Semi Permeable Membrane) کا کام کرتی ہیں۔امینو ایسڈ اور شکر وغیرہ آسانی سے خون کی باریک نلیوں کے ذریعہ جذب ہو کر جگر میں پہنچتی ہیں۔فیٹی ایسڈ اور گلیسرول لمف کی نلیوں کے ذریعہ جذب ہو کر نظام لمف میں شامل ہو جاتے ہیں جہاں سے یہ قنات صدر (Thoracic Duct) میں داخل ہوتی ہیں اور دل کے قریب وریدی نظام (Verdus System) میں شامل ہو جاتے ہیں۔

غذا کا استحالہ(Melabolism)

متحول غذا جذب ہو کر خون کے ذریعہ جب جسم کے کسی مخصوص حصہ میں پہنچتی ہے تو وہاں تین طرح سے استعمال ہوتی ہے۔(1) مزید چھوٹے اور کیمیاوی اجزا میں ٹوٹ کر توانائی (کیلاری) پیدا کرتی ہے۔اس عمل کو تفرق (Calabolism) کہتے ہیں۔(2) نیا مادۂ حیات Protoplasm بناتی ہے، اس کو تجمع(Anabolism) کہتے ہیں (3) ذخیرہ کے طور پر گلائیکوجن اسٹارچ یا چربی کی شکل میں جمع ہوتی ہے۔اس طرح غذائی اجزا کا ٹوٹنا اور بننا برابر ہوتا رہتا ہے۔

تفرق(Calabolism)

جسم کو کام کرنے کے لیے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔یہ توانائی اس کو غذا سے حاصل آسان کیمیاوی اجزا کے ٹوٹنے سے حاصل ہوتی ہے۔اجزا میں یہ توانائی ان کے اندر موجود کیمیاوی گرفت Chemical Bond کی وجہ سے ہوتی ہے۔یہ گرفت جب ٹوٹتی ہے تو اس کے متبادل (Equivalent) توانائی (کیلاری) کا ظہور ہوتا ہے۔مثلاً جب گلوکوز کا تکسیدی عمل Oxidation ہوتا ہے تو کاربن ڈائی آکسائڈ گیس اور پانی بنتے ہیں اور توانائی کا خروج ہوتا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل

کیمیاوی مساوات سے ظاہر ہے۔

$C_6\ H_{12}0_6+0_2$ Enzyme+Co_2+H_2O+Energy

(توانائی)   (پانی) (کاربن ڈائی آکسائڈ) (انزائم) (آکسیجن) (گلوکوز)

اس عمل میں کئی درمیانی اعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً جسم میں گلوکوز $C_6\ H_{12}\ O_6$ پہلے پائرُوک ایسڈ (CH3 C O COOH) پھر ایسٹیک ایسڈ(CH_3COOH)اور بعد میں ایک پیچیدہ سڑک ایسڈ چکر کے بعد کاربن ڈائی آکسائڈ اور پانی میں تبدیل ہوتا ہے۔ ان سب مراحل میں انزائم کام کرتے ہیں اور توانائی کا اخراج ہوتا ہے۔

عضلات میں توانائی پیدا ہونے کا طریقہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہے۔ خون میں دورہ کرتا ہوا گلوکوز عضلہ کے منسوجات میں پہنچ کر گلائیکوجن ($C_6H_{10}O_5$) کی شکل میں جمع ہوتا ہے۔ تجربہ سے پتہ چلا ہے کہ عضلاتی انقباض(Muslce Contraction) گلائیکوجن، آکسیجن اور نامیاتی فاسفیٹ کی منسوجات میں کمی واقع ہوتی ہے جب کہ لیکٹک ایسڈ، کاربن ڈائی آکسائڈ اور غیر نامیاتی فاسفیٹ جمع ہوتے ہیں۔ آکسیجن کی موجودگی میں آہستہ آہستہ پہلے والی حالت پھر آ جاتی ہے۔ یہ سلسلہ وقوع ورزش تکان، گہری سانس لینا اور صحت یابی کے تماثل ہیں جیسا کہ انسان اور جانوروں میں دیکھا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل کیمیاوی مساوات سے موٹے طور پر اس کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ATP----ADP + In Organic Phosphate+Energy

(توانائی) (غیر نامیاتی فاسفیٹ) (اڈنوسن ڈائی فاسفیٹ) (اڈنوسن ٹرائی فاسٹیٹ)

اس طرح توانائی حاصل ہونے میں اڈ نوسن ٹرائی فاسفیٹ کا استعمال ہوتا ہے اور اڈ نوسن ڈائی فاسفیٹ بن جاتا ہے۔ اگر ضرورت ہوئی تو یہ مزید ٹوٹ کر اڈ نائلک ایسڈ میں بدل جاتا ہے اور مزید توانائی حاصل ہوتی ہے۔(ATP) کو پھر حاصل کرنے کے لیے اوپر لکھی کیمیاوی عمل دوسری طرف (دوطرفہ تعامل کی وجہ سے) ہونے لگتی ہے۔ اس کے لیے توانائی عضلات میں جمع گلائیکوجن کے ٹوٹنے سے حاصل ہوتی ہے۔ گلائیکوجن غیر نامیاتی فاسفیٹ سے تعامل کرتا ہے اور پائرُوک ایسڈ $C_3H_4O_3COOH$ بناتا ہے اور توانائی دیتا ہے۔ اس کے بعد لیکٹک ایسڈ (CH3CBOH OOOH) بنتا ہے جس سے مزید توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح عضلات کی فعلیت(Activity) کے لیے توانائی ATP کے ٹوٹنے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس ATP کو پھر بننے کے لیے توانائی عضلات میں موجود گلائیکوجن سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ عمل اس وقت تک ہوتا رہتا ہے جب تک گلائیکوجن موجود ہے۔

کاربوہائیڈریٹ کے تحول میں جگر ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں غذا سے خون میں آیا ہوا گلوکوز، گلائیکوجن میں بدل جاتا ہے۔ یہ گلائیکوجن ضرورت کے وقت پھر گلوکوز میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ گلوکوز کی وجہ سے خون میں شکر کی مقدار تقریباً 0.17 ہوتی ہے۔ خون کے ساتھ گلوکوز جسم کے تمام حصوں میں پہنچتا ہے۔

تجمع(Ambolism)

جسم میں غذا سے حاصل آسان کیمیاوی اجزا مل کر ضرورت کے مطابق انزائم کے عمل سے بڑے بڑے کیمیاوی اجزا میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ بڑے کیمیاوی اجزا پروٹین، نیوکلئک ایسڈ چربی(Lipid) وغیرہ ہیں۔ نیوکلئک ایسڈ پیورین اور پریمڈین اکائیوں کے ساتھ شکر اور فاسفیٹ کے ملنے سے بنتے ہیں۔ انھیں کے ذریعہ جسم کی ساخت اور صفات طے ہوتی ہیں۔ پروٹین اور انزائم امینوایسڈ کے ملنے سے بنتے ہیں۔ جسم کے مختلف حصوں میں مختلف پروٹین پائی جاتی ہیں مثلاً خون میں ہیموگلوبن، دودھ میں کیسین، عضلات میں عضلاتی پروٹین وغیرہ۔ پروٹین کی قسم اور خصوصیات ان میں موجود امینوایسڈ کی قسم تعداد اور کیمیاوی ترکیب کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ پروٹین کے بننے میں نیوکلئک ایسڈ کو خاص دخل ہے۔ جسم میں غذا سے حاصل آسان کیمیاوی سالموں کے ذریعہ ہی فیٹی ایسڈ، ٹرائی گلیسرائڈ اور شحمیات جیسے کلوسٹرال فاسفولائپڈ، لائپو پروٹین وغیرہ کی تعمیر ہوتی ہے۔

(ہماری غذا، شکیل احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، تیسری طباعت 2010)

حسن کی نگہداشت

چہرے کی رنگت کچھ ہی دن میں بدلنے لگے گی بس کھانے کے بعد اس چیز کا استعمال معمول بنالیں۔

آ جلد کو نرم بنانے اور رنگت میں نکھار لانے کا بہترین اور گھریلو نسخہ

آلو کے قتلے سے چہرے کو صاف کریں اس سے جلد نرم اور رنگت نکھر جائے گی۔ ابٹن کا استعمال خواتین میں عام ہے۔ ابٹن مختلف جڑی بوٹیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کو لگانے سے چہرے کی تازگی بحال ہوتی ہے اور رنگت صاف ہوتی ہے۔

سرسوں کے تیل سے سیاہ کہنیوں کو بنائیں خوبصورت

کیا آپ کی کہنیاں بھی بدنما ہیں۔ کہنیوں پر سرسوں کے تیل کا مساج بھی ان کی خوبصورتی اور رعنائی میں اضافہ کرتا ہے۔ ان پر پیدا ہونے والی خشکی کو کنٹرول کرکے کہنیوں کو بدنما ہونے سے بچاتا ہے۔

کیا آپ بھی اپنی جلد کی رنگت صاف کرنا چاہتی ہیں۔اس کے لیے روزانہ صبح اور رات کو کھانا کھانے کے بعد اس ٹوٹکے کا استعمال شروع کردیں۔کھانے کے بعد تھوڑی مقدار میں سونف کھانے سے خون صاف ہونے لگتا ہے۔ساتھ ہی جلد کی رنگت بدلنے لگتی ہے۔

آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ہوگئے ہیں تو انھیں بتائے گئے طریقے سے کریں ختم

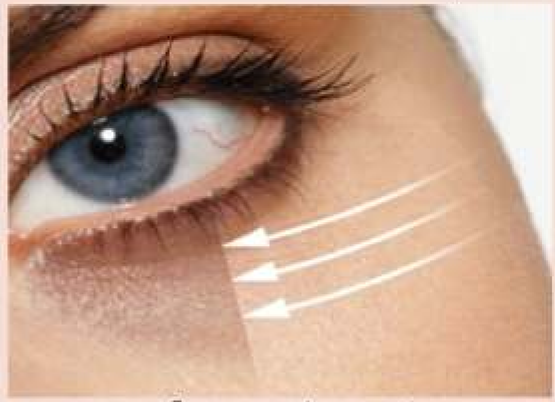

چند گلاب کی پتیوں کا پانی، ایک کھانے کا چمچ سونف، ایک کھانے کے چمچ Chamomile، تمام اجزا کو پانی میں اُبال لیں اور پھر ایک بوتل میں پانی محفوظ کرلیں۔دن میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے استعمال کریں۔

تیز پات سے گرتے بالوں کو روکنے کا حیرت انگیز ٹوٹکہ

تیز پات میں کچھ ایسی غذائیت ہوتی ہے جو بال گرنے سے روکتی ہے۔ساتھ ہی بالوں سے خشکی کا بھی خاتمہ کرتی ہے۔دو کپ پانی میں 8 سے 10 عدد تیز پات اُبالیں اتنا کہ پانی کا رنگ تبدیل ہوجائے۔پھر نارمل طریقے سے شیمپو سے بال دھو کر اس پانی سے بال گیلے کرلیں۔7 دنوں تک لگاتار اس ٹوٹکے کو دھرائیں، حیرت انگیز نتائج دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے۔

جسم اور چہرے میں خشکی کے بدنما داغ ہوگئے ہیں تو ابھی اس کا خاتمہ کریں

اکثر چہرے اور جسم میں خشکی کے بدنما داغ بن جاتے ہیں تو بتایا گیا طریقہ اپنائیں۔جسمانی خشکی دور کرنے کے لیے ایک آسان سا عمل یہ ہے:

آپ گھی میں تھوڑا سا نمک ملا کر جسم پر مالش کریں۔تو اس سے خشکی دور ہوجائے گی۔

نوٹ: یہ ایک عام معلومات ہے مزید معلومات کے لیے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

بیکنگ سوڈا کا ایسا کمال کے جان کر آپ بھی حیران رہ جائیں جو کرے آپ کے پیروں کو منٹوں میں صاف

ایک چھوٹا ٹب گرم پانی سے بھریں۔اب اس میں دو چمچ بیکنگ سوڈا اور ایک چمچ نمک شامل کریں۔اپنے پیروں کو پندرہ سے بیس منٹ تک ٹب میں رکھیں۔یہ اچھی طرح سے آپ کے پیروں کو صاف کردے گا اور آپ کی جلد کو تازگی کا احساس بھی ہوگا

□□□

(بحوالہ:www.hamariweb.com)

تاثرات: نگرنگرسے

''خواتین دنیا'' مئی 2019 موصول ہوا۔ مشعل کی روشنی میں آپ نے اردو کی اہمیت اوراس کی ترقی کے لائحہ عمل پر بحث کی ہے کیونکہ یہ مادری زبان بھی ہے۔ اس مناسبت سے ''خواتین دنیا'' میں اس کا تذکرہ اہمیت اختیار کرجاتا ہے۔ ص 9 پر ''رضیہ سلطان'' نسوانی جرأت وذکاوت عدل و انصاف ورعایا پروری پر بے مثال تحریر ہے، جبکہ ص 13 پر دیا گیا سرورق مقالہ ''شفقت آمنہ'' کامرانی وحوصلہ مندی کا محرک ایسے مضامین کی شمولیت کی ازحد ضرورت ہے۔ ص 18 اور ص 23 پر بالترتیب فراق کی رباعیات اور جوش کے کلام پر دلنشین تحریریں پیش کی گئی ہیں۔ ان مضامین کے بارے میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں ورغلانا مفسدانہ حرکت ہے۔ اس کے بجائے دونوں میں انصاف باہمی مفاہمت اور یگانگت کو پروان چڑھانا چاہیے کیونکہ عورت کے حمایتی اس کا باپ، بھائی، بیٹے اور شوہر سارے مرد ہوتے ہیں۔ یوں بھی مردوں اور عورتوں کی اکثریت سمجھدار ہوتی ہے۔ تقابل کا یہ شوشہ سستی شہرت کے حریص، بدنیت اور گمراہ کن عناصر کا چھوڑا ہوا ہے۔ حیف صد حیف۔ ص 34 پر ''صغرا مہدی'' پر بہت عمدہ مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں رشوت خوری اور بدعنوانی کے خلاف اصول پرستی اور فرض شناسی پر دل خوش کن سبق دیا گیا ہے۔ ص 40 پر بعنوان ''مدد بنام پبلسٹی'' بڑی سبق آموز کہانی لکھی گئی ہے۔ دیگر کہانیاں بھی قابل تعریف ہیں۔ ص 50 پر ''حسن سخن'' کے تحت نظمیں دی گئی ہیں اور ص 14 پر شاعرات کے منتخب اشعار تو بہت خوب اور قابل داد ہیں، خصوصاً صغریٰ عالم اورزاہدہ زیدی کے اشعار پُراثر ہیں۔ نیز سیدہ فرحت کا شعر:

کیا بتائیں تمھیں ہم منزل عرفاں کیا ہے
صرف ایک عالم حیرت کے سوا کچھ بھی نہیں

لاجواب ہے۔ بہرحال اس مرقع حسن وجمال میں اس کے علاوہ لذیذ پکوان، ہماری غذا، حسن کی نگہداشت، اورتواور خواتین خبرنامہ سب کچھ شامل ہے۔ اورکیا درکار ہے؟

مصطفی ندیم خاں غوری، زرّین ولا، روضہ باغ، اورنگ آباد (مہاراشٹرا)

آپ کی ادارت میں خواتین دنیا کی مقبولیت روز بروز خوب سے خوب تر ہوتی نظر آرہی ہے۔

تازہ شمارہ جولائی 2019 میں ممتاز محقق عبدالعزیز عرفان نے ملکہ نورجہاں کا تعارف علم وادب کے حوالے سے بہت عمدگی سے کرایا ہے۔ شاعرات کے منتخب اشعار کے مطالعہ سے عصر حاضر کی نسائی شاعری کے ارتقاء کا بخوبی علم ہوا' آزادی کے بعد عورتوں کی سماجی حیثیت' اور' اردو ادب میں تانیثیت' جیسے مضامین ہماری معلومات میں اضافہ کا موجب ہیں۔ کہانیوں میں نصرت شمسی کی 'بوجھ' اور نسرین بیگم علیگ کی 'ادھوری نشانی' کامیاب کاوشیں ہیں۔ حسن سخن میں ایمن تنزیل نے اپنی نظم کائناتی صداقت کی پہچان کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ خواتین خبرنامہ بھی بہت مفید ہے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے خواتین کے لیے یہ خوبصورت رسالہ شائع کرکے نسائی ادب کے فروغ میں بنیادی خدمت انجام دی ہے۔

ڈاکٹر شعائراللہ خاں وجیہی، ایڈیٹر۔ ضیاءِ وجیہ، رامپور (یوپی)

□□□

خواتین خبرنامہ

ہماداس کی فتح کا سلسلہ جاری، جیتا پانچواں طلائی تمغہ

روز نامہ راشٹریہ سہارا، 22 جولائی 2019، نو میستو (جمہوریہ چیک) (یو این آئی)۔ ہندوستان کی اسٹار ایتھلیٹ ہماداس نے اپنا جیت کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ہفتہ کو یہاں 400 میٹر کی دوڑ میں طلائی تمغہ

حاصل کیا ہے جو ان کا اس مہینے میں بین الاقوامی مقابلوں میں پانچواں طلائی تمغہ بھی ہے۔ ہما نے یہاں 400 میٹر مقابلے میں 52.09 سیکنڈ میں دوڑ مکمل کر پہلا مقام حاصل کیا۔ انھوں نے اس دوڑ کو اپنے دوسرے بہترین وقت میں مکمل کیا۔ ان کا ذاتی بہترین وقت 50.79 سیکنڈ ہے جسے انھوں نے گزشتہ ایشیائی کھیل کے دوران حاصل کیا تھا۔ پانچواں طلائی تمغہ جیتنے کے بعد 19 سالہ ہما نے ٹویٹ کر کہا کہ جمہوریہ چیک میں 400 میٹر کی دوڑ میں ٹاپ پر رہ کر اپنی دوڑ پوری کی۔ اس سے پہلے انھوں نے اسی ماہ کی دو جولائی کو پولینڈ میں پوجنان گراں پری میں اپنا پہلا طلائی تمغہ جیتا تھا جبکہ پولینڈ میں ہی سات جولائی کو کتنو ایتھلیٹکس میٹ میں پہلے نمبر پر رہتے ہوئے دوسرا، گزشتہ 13 جولائی کو جمہوریہ چیک میں کلاڈنو ایتھلیٹکس میٹ میں تیسرا اور 17 جولائی ٹیبورا ایتھلیٹکس میٹ میں اپنا چوتھا طلائی تمغہ جیتا تھا۔ ہما نے پہلے چار طلائی 200 میٹر دوڑ میں جیتے تھے۔ مردز مرے میں 200 میٹر کی دوڑ میں محمد انس نے 46.05 سیکنڈ میں دوڑ مکمل کی اور تیسرے مقام پر رہتے ہوئے انھیں کانسے سے اکتفا کرنا پڑا۔ اس سے پہلے انس نے 13 جولائی کو کلاڈانو ایتھلیٹکس میٹ میں 400 میٹر مقابلے میں طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔

خاتون کرکٹ 2022 دولت مشترکہ کھیلوں میں شامل

روزنامہ راشٹریہ سہارا، 14 اگست 2019 (لندن، یو این آئی) انگلینڈ کے برمنگھم میں سال 2022 میں ہونے والے دولت مشترکہ کھیلوں میں خاتون کرکٹ کو شامل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اس سے پہلے سال 1998 میں دولت مشترکہ کھیلوں میں کرکٹ کو شامل کیا گیا تھا لیکن اس وقت مردوں کی ٹیم نے اس میں حصہ لیا تھا اور جنوبی افریقہ نے اس مقابلے میں طلائی تمغہ جیتا تھا۔ کرکٹ کو لاس اینجلس میں 2028 میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں شامل کرنے کی کوشش بھی چل رہی ہے۔ سال 1998 میں کوالالامپور میں ہوئے دولت مشترکہ کھیلوں میں کرکٹ 50 اوور کے فارمیٹ میں کرایا گیا تھا لیکن برمنگھم میں اسے ٹوئنٹی 20 کی حیثیت سے کرایا جائے گا۔ قابل ذکر ہے کہ برمنگھم میں ہونے والے دولت مشترکہ کھیل 27 جولائی سے سات اگست 2022 تک چلیں گے۔ اس دوران کرکٹ کے تمام میچ ایجبسٹن میں کرائے جائیں گے۔

دولت مشترکہ کھیل یونین (سی جی ایف) کے صدر ڈیم لوئیس

مارٹن نے کہا کہ آج کا دن تاریخی ہے اور ہم کرکٹ کا ایک بار پھر دولت مشترکہ کھیلوں میں خیر مقدم کرتے ہیں۔ سال 1998 کے دولت مشترکہ کھیلوں میں کوالالامپور میں کھیلے گئے آخری کرکٹ ٹورنامنٹ میں رکی پونٹنگ، جیکس کیلس اور سچن تندولکر جیسے عظیم کھلاڑی بھی شامل تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں یقین ہے کہ خاتون کرکٹ کو دنیا بھر میں فروغ دینے کے لیے دولت مشترکہ کھیل ایک بہترین ذریعہ ہے۔ ہم اس کے لیے بین الاقوامی کرکٹ ایسوسی ایشن (آئی سی سی) کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنھوں نے اس کھیل کو دولت مشترکہ کھیلوں میں شامل کرنے کے لیے کافی محنت کی ہے۔

آئی سی سی کے چیف ایگزیکٹو آفیسر ساہنی نے کہا کہ آئی سی سی اس فیصلے کا خیر مقدم کرتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ فیصلہ خاتون کرکٹ کو فروغ دینے کے لیے بڑا قدم ثابت ہوگا۔ یہ واقعی خاتون کرکٹ اور کرکٹ کمیونٹی کے لیے تاریخی دن ہے۔ ساہنی نے کہا کہ دولت مشترکہ کھیلوں کے لیے ٹوئنٹی 20 فارمیٹ بہترین اور مناسب ہے۔ تمام کھلاڑی جوان کھیلوں میں شامل ہوں گے ان کے لیے یہ ایک اچھا تجربہ ہوگا۔ خاتون کرکٹ مسلسل تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ہم دولت مشترکہ کھیل فیڈریشن کا خاتون کرکٹ کو دولت مشترکہ گیمز میں شامل کرنے کے لیے شکریہ ادا کرتے ہیں۔

چار ہزار کلومیٹر سائیکل ریس
جرمن خاتون فیونا کولبنگر نے تاریخ رقم کردی

برلن۔6 اگست (ایجنسیز) روزنامہ منصف، حیدرآباد۔ جرمن کی ایک کینسر ریسرچر خاتون نے 4 ہزار کلومیٹر کی سائیکل ریس میں مردوں کی بڑی تعداد افراد کو شکست دے کر نئی تاریخ رقم کردی۔ جرمنی کی 24 سالہ کینسر ریسرچر فیونا کولبنگر نے سائیکل ریس میں 200 مردوں اور مجموعی طور پر 264 افراد کو شکست دے کر تاریخ رقم کی۔ فیونا کولبنگر یورپ میں ہونے والی 'ٹرانس کانٹی نینٹل سائیکل ریس' جیتنے والی پہلی خاتون بن گئیں۔ ٹرانس کانٹی نینٹل سائیکل ریس کے مطابق خاتون سائیکل سوار نے 10 دن تک

جاری ریس میں سب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ ریس بلغاریہ سے شروع ہوئی اور یورپ کے سب سے بڑے ملک فرانس میں ختم ہوئی۔ ریس کے دوران سائیکل سوار خاتون آٹھ یورپی ممالک سے ہوتی ہوئی فرانس پہنچی۔ جن آٹھ ممالک سے یہ سائیکل سوار گزری ان ممالک میں بلغاریہ، آسٹریا، بوسنیا، کروشیا، اٹلی، کوسوو، سربیا، سلوینیا اور سوئٹزرلینڈ شامل ہیں۔ ریس کا فاصلہ انھوں نے 10 دن 2 گھنٹے 48 منٹ میں طے کیا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت

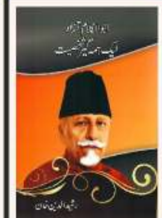

مصنف: رشید الدین خان

صفحات: 684

قیمت: 235 روپے

فرہنگِ مولانا ابوالکلام آزاد

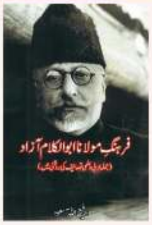

مصنف: رفیع اللہ مسعود

صفحات: 669

قیمت: 290 روپے

درسِ بلاغت

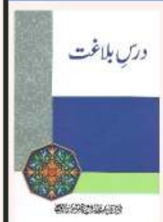

ادارہ

صفحات: 230

قیمت: 85 روپے

قومی یکجہتی ایک مطالعہ اور تجزیہ

مصنف: ابوسفیان

صفحات: 203

قیمت: 110 روپے

گوپال متل (مونوگراف)

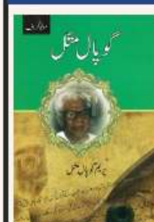

مصنف: پریم گوپال متل

صفحات: 117

قیمت: 80 روپے

کوثر چاندپوری (مونوگراف)

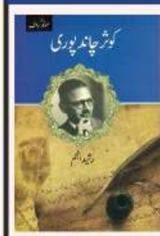

مصنف: رشید انجم

صفحات: 150

قیمت: 90 روپے

ہندوستان میں تانیثیت

مرتبہ: عذرا عابدی

صفحات: 392

قیمت: 180 روپے

برق اور مقناطیس

مصنف: محمد یٰسین

صفحات: 158

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly September 2019, Vol.0 3, Issue: 09 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad , Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025